ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء

☆ باطل نظام میں نظام خلافت کی پیوند کاری ممکن نہیں : نقطہ نظر
☆ سیاسی عمل.....یا بد عملی : ایک یادگار تحریر
☆ ہماری صحافت مقصدیت یکسر عاری ہے : مکالمہ

حدیثِ امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

جعل سازی

گزشتہ ہفتے کے دوران چند ایسے واقعات نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے اور دو ایک ذاتی مشاہدے میں آئے کہ اضطرابی کیفیت مسلسل طاری ہے۔ اسی لیے ان واقعات کو قارئین کرام کی خدمت میں بیان کر دینے کی جسارت کر رہا ہوں کہ شاید کچھ بوجھ ہلکا ہو سکے۔ ایک معتبر شخص طبیب سے اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ چند ماہ سے اس کی صحت بتدریج گرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس نے ڈاکٹر کے مشورے سے ٹیسٹ کرائے تو معلوم ہوا کہ ذیابیطس (شوگر) پہلے کی نسبت کافی زیادہ ہو چکی ہے جس کی وجہ سے جسمانی نظام کے کچھ حصے خطرناک حد تک متاثر ہوئے اور نقاہت میں ناقابل برداشت اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر شوگر کی دوائی کو دوگنا کر دیا اور ہر ہفتہ ٹیسٹ کروانے کو کہا۔ اس شخص نے بتایا کہ جب دو ہفتے کے بعد کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ مرض بڑھ گیا تو ڈاکٹر نے اگلے روز سے انسولین کے ٹیکے لگانے کا فیصلہ کر دیا۔ اسی شام چونکہ سرکاری محکمہ سے ملنے والی شوگر کی دوائی ختم ہو چکی تھی چنانچہ اس شخص نے لاہور کے ایک معروف دوا فروش سے دوائی خریدی اور رات کو حسب معمول استعمال کی۔ اگلے ہی روز انسولین کا ٹیکہ لگانے سے پہلے ڈاکٹر نے جب شوگر کا ٹیسٹ کیا تو وہ حیران رہ گیا کہ شوگر کنٹرول میں تھی۔ ایک دو روز مزید ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پہ پہنچا کہ وہ شخص کئی مہینوں سے شوگر کی جو دوائی استعمال کر رہا تھا وہ نقلی اور جعلی تھی۔ یہ واقعہ سن کر طبیب بولا کہ چند روز پہلے اس کے جان پہچان والے ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ سرکاری محکمہ جات میں دوائیاں سپلائی کرنے کا کام کرتا ہے۔ ان دنوں اس شخص کا ایک دیرینہ محسن ایک اعلیٰ ادارے میں دوائیوں کے سٹور کا انچارج تعینات ہوا جس وجہ سے دوائیاں بنانے والی کمپنیاں اب اس شخص کو نمائندہ بنانے کے لئے اس کی منتیں کر رہی ہیں۔ اس شخص نے مزید بتایا کہ مذکورہ بڑے افسر خدمت میں ایک ماہ قبل دس لاکھ روپیہ کا تحفہ پیش کرتے ہوئے دوائیوں کی ایک بڑی کھیپ بلا تردد منظور ہو گئی۔ بس کیپسولوں میں بقسم آٹا کوئی شے بھری تھی جس کے بارے میں سپلائی کرنے والا یقین دلا رہا تھا کہ وہ کیپسول کسی صورت مضر صحت نہیں!!

انہی دنوں ایک سٹور میں ڈبل روٹی خریدنے کے لئے ہمارا جانا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ ایک گاہک کے پیتل کے بنے برتن میں دکاندار دودھ کے پیکٹ کھول کھول کر انڈیل رہا تھا۔ ہم سے صبر نہ ہوا تو دکاندار سے پوچھ ہی ڈالا "بھائی یہ کیا ماجرا ہے' دودھ فروش کے برتن میں پیکٹوں کا دودھ کیوں کر ڈالا جا رہا ہے؟" دکاندار اور گاہک دونوں کے چہروں پہ خفت آمیز کھسیانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ گاہک جو واقعی دودھ فروش تھا بولا "دودھ کم ہو گیا تھا۔ اس لئے پکے گاہکوں کو دودھ پہنچانے کے لئے ایسا کیا ہے"۔ ہم نے پوچھا "اس میں آپ نلکے سے پانی ملائیں گے یا کسی گندے پانی کی نالی سے؟"۔ دودھ فروش نے جواب کیا دینا تھا۔ ہم ڈبل روٹی لے کر چل دیئے۔ یہ نالی سے گندا پانی ڈالنے والی بات ہمارے ذہن کی اختراع نہ تھی بلکہ چشم دید واقعہ اس کا پس منظر تھا۔ تیس سال قبل ہم نے ملتان میں فوجی ڈیری فارم کی گاڑی کے عملے کو دودھ کے ڈرم میں ایک محلے کے گھروں کی بہتی ہوئی نالی سے پانی ڈالتے ہوئے خود دیکھا تھا۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ گندا پانی اس لئے ایسے کام میں مفید ہوتا ہے کہ بھاری ہونے کی وجہ سے دودھ ٹیسٹ کرنے کا آلہ مات کھا جاتا ہے اور "سب ٹھیک" بتاتا ہے۔

انہی دنوں کا ایک اور تلخ تجربہ یاد آ گیا جو قارئین کی نذر کئے دیتے ہیں۔ ملتان سے لاہور بذریعہ کار آتے ہوئے ہم صبح کے وقت "کسان" پہنچے تو ایک دکان پہ دو تین کٹے ہوئے دیدہ زیب سرخ (ریڈ بلڈ) مالٹے نظر آئے۔ ہمارے دریافت کرنے پر دکاندار نے یقین دلایا

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

قیمت ۶ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الھدیٰ

اے ہمارے رب' ہم نے سنا ایک پکارنے والے کو کہ جو پکارتا ہے ایمان کے لئے' کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر' تو ہم ایمان لے آئے

(وہ اہل خرد اور اہل دانش جو اپنی فطرت سلیمہ کی رہنمائی میں عقل کی جملہ وادیاں طے کرتے ہوئے نہ صرف توحید تک رسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں بلکہ ان کا عقلی و فکری سفر انہیں یوم آخرت کے وقوع کا قائل بھی بنا دیتا ہے' جب نبی کی پکار کو سنتے ہیں اور کلام اللہ پر مشتمل دعوت ایمان جب ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو اس شان سے لپک کر اس دعوت کو قبول کرتے ہیں کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!")

اے ہمارے رب' اب بخش دے ہمارے گناہ اور ہم سے ہماری برائیوں کو دور کر دے اور ہمارا انجام نیک لوگوں کے ساتھ کرO

(علم وحی کے چشمے سے فیضیاب ہونے اور حقائق کائنات کے منکشف ہونے کے بعد ان کے لبوں پر ہر دم یہی دعا ہوتی ہے کہ پروردگار! بشری کمزوریوں کے باعث جو گناہ ہم سے سرزد ہو گئے ہوں' تو ان کی پردہ پوشی فرما' ہماری برائیوں اور کمزوریوں کو ہم سے دور کر دے اور موت کے بعد ہمیں نیکو کاروں کی صف میں شامل فرمانا کہ یہی اصل کامیابی ہے۔)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

اے ہمارے رب' ہمیں عطا فرما وہ سب جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اپنے رسولوں کے واسطے سے' اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا' بے شک تو وعدے کے خلاف نہیں کرتاO

(یہ جاننے کے بعد کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے' وہ اللہ سے اس دنیا میں کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے بلکہ اخروی کامیابی ہی کے لئے دعا گو رہتے اور آخرت کی ذلت و رسوائی سے پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے پروردگار کی ذات پر اس درجے بھروسہ اور اس کے وعدوں پر اتنا یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کی خاطر دنیا کے ساز و سامان اور یہاں کے عیش و آرام کو تج دینے کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں۔)

(سورہ آل عمران' آیت ۱۹۳ اور ۱۹۴)

جوامع الکلم

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس تابع نہ ہو جائے اس ہدایت کے جو میں لایا ہوں۔

(کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد بھی اگر زندگی ان کی اطاعت کے سانچے میں نہیں ڈھل رہی تو اس ایمان کے کیا معنی! ایمان کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ انسان اپنی زندگی کے ہر ہر گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ ہدایت کو مشعل راہ بنائے اور اپنی خواہشات نفس کو اس کے تابع کر دے)

(مشکوٰۃ المصابیح)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۴ شمارہ ۴۰
۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء

13

مدیر : حافظ عاکف سعید
معاون مدیر : نثار احمد ملک

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴۔اے، مزنگ روڈ، لاہور

مقام اشاعت
۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون : ۵۸۶۹۵۰۱

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ : ۶/- روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۲۵/- روپے

زرتعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۳ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰ " "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

گزشتہ شمارے میں کراچی کی سنگین صورتحال کے حوالے سے دو مضامین شامل تھے۔ ان میں سے ایک کراچی میں مقیم ہمارے مستقل قلمی معاون جناب نجیب صدیقی صاحب کا تحریر کردہ تھا جس میں کراچی کی صورتحال کے ضمن میں ان کا شدت احساس نمایاں طور پر جھلک رہا تھا' اور دوسرا مضمون کراچی ہی کے ایک قلمکار ایس ایم اختر صاحب کا تھا جس میں کراچی کے موجودہ حالات کا سقوط مشرقی پاکستان سے متعلقاً قبل کے حالات کے ساتھ موازنہ بہت سلیقے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ محترم نجیب صدیقی صاحب کا مضمون اگر مہاجروں کے احساسِ محرومی اور مظلومیت کا غماز تھا اور اس حوالے سے اس کے بین السطور کسی قدر ایم کیو ایم کی طرفداری محسوس ہوتی تھی' تو جناب ایس ایم اختر کے مضمون میں کراچی کے حالات کے بگاڑ کے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ایم کیو ایم اور اس کے قائد کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی بھی کی گئی تھی' گویا دونوں طرف کے نقطۂ نظر کو "ندائے خلافت" میں جگہ دی گئی تھی' اور ہمارے نزدیک یہی طرزِ عمل درست اور صائب ہے۔ ہمیں کسی بھی معاملے میں کوئی رائے بنانے سے قبل ہر فریق کی بات کو ٹھنڈے دل سے سننا اور اس کے موقف کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ یہی عادت ہم اپنے قارئین میں پختہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم ہمیں حیرت ہوئی جب کراچی کے ایک ساتھی کی جانب سے ہمیں محترم نجیب صدیقی صاحب کے مضمون پر شدید احتجاجی ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ اندازہ یہ ہوا کہ گروہی اور طبقاتی تعصبات کی دلدل سے نکلنا آسان کام نہیں ہے۔ کراچی میں حالات اتنے سنگین اور ابنارمل ہو چکے ہیں اور فضا اس درجے مسموم ہو چکی ہے کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور کسی معتدل اور متوازن رائے تک پہنچنا اہلِ کراچی کے لئے قریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ نجیب صدیقی صاحب کے خیالات سے خواہ کوئی اختلاف رکھتا ہو تاہم ان کے مکتوب سے یہ اندازہ تو یقیناً ہوتا ہے کہ کراچی میں مقیم ہمارے مہاجر بھائیوں کے حقیقی احساسات کیا ہیں! صدیقی صاحب ایک پختہ ذہن اور دینی سوچ رکھنے والے بزرگ ہیں جو گرد و پیش پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور عام زندگی میں غیہ جذباتی انداز میں سوچنے کے عادی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت زیرِ نظر شمارے میں شامل ان کا تازہ مضمون ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر اس دانا و بینا کے احساسات کا یہ عالم ہے (جس کا مظہران کا وہ مضمون ہے جو گزشتہ شمارے میں "مکتوب کراچی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا) تو کراچی کے عام مہاجر کی اور بالخصوص نوجوانوں کی سوچ اور شدت جذبات کی کیفیت کیا ہو گی۔

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا

ہمدردی اور خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے تمام بھائیوں کے خواہ وہ سندھی ہوں یا مہاجر' اور خواہ بلوچی اور پٹھان ہوں یا پنجابی' جذبات و احساسات کو جاننے اور ان کی شکایتوں کو سمجھنے کی امکان بھر کوشش کریں اور ان کی محرومیوں کے ازالے کے لئے اپنی بساط بھر سعی کریں۔ ہمیں اپنے اندر یہ صلاحیت اجاگر کرنی چاہئے کہ ہم خود کو دوسروں کی جگہ پر رکھ کر' گویا دوسروں کے حالات و کیفیات اپنے اوپر طاری کر کے ان کے اصل دکھ اور محرومی کا ادراک کر سکیں۔ دوسروں پر محض تنقید کر کے اور درشت انداز میں مذمت کر کے فارغ ہو جانا بڑا آسان ہے۔ مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

☆ ☆ ☆

زیرِ نظر شمارے میں نظام خلافت سے متعلق مولانا سید وصی مظہر ندوی کی ایک فکر انگیز تحریر شامل ہے۔ مولانا کی دینی و علمی حیثیت تو مسلم ہے ہی' سیاسی و انتظامی میدان میں بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مولانا ایک طویل عرصے تک حیدر آباد کے میئر رہے اور مختصر عرصے کے لئے ایک وفاقی وزارت کا قلمدان بھی ان کے پاس رہا۔ ہم مولانا کے ممنون ہیں کہ وہ دو ماہ قبل ہماری دعوت پر تحریک خلافت کے زیر اہتمام "کراچی سیمینار" میں بھی تشریف لائے اور اب ایک وقیع مضمون "ندائے خلافت" کے لئے ارسال فرمایا۔ گو مضمون کے بعض مندرجات سے ہمیں جزوی اختلاف ہے' تاہم ان کے مضمون کو ہم من و عن ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔○○

موجودہ باطل نظام میں نظام خلافت کی پیوند کاری ممکن نہیں

ہمارے تمام دکھوں کا مداوا نظام خلافت کے قیام میں ہے

مغربی جمہوری نظام مسلمان امت کے اجتماعی مزاج کے خلاف ہے

سابق وفاقی وزیر اور میسر حیدر آباد مولانا سید وصی مظہر ندوی مدظلہ کی "ندائے خلافت" کے لئے خصوصی تحریر' جس میں انہوں نے "نظام خلافت کا مطالبہ کیوں؟" کا پر مغز جواب دیا ہے

نظام خلافت قائم کرنے کا مطالبہ پاکستان میں اب کوئی اجنبی نہیں رہا ہے۔ داعی عالمی متحدہ مجلس خلافت پاکستان' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم اسلامی' پاکستان نظام اسلام پارٹی' تحریک خلافت' تحریک احیائے خلافت' تحریک خلافت راشدہ اور عالمی مجلس خلافت کے علاوہ انجمن سپاہ صحابہ نیز اہل حدیث جانباز فورس کا مطالبہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا اس مطالبہ کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم عنوان کے مطابق نظام خلافت کی تفصیلات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بالاختصار ان دلائل کو ایک بار پھر پیش کر دیا جائے' جن دلائل کی بنیاد پر خلافت قائم کرنے کا مطالبہ اٹھایا جا رہا ہے۔

ان میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اس کائنات میں بااقتدار مخلوق نہیں ہے بلکہ زمین اور آسمان کی تمام مخلوق جس طرح خالق کائنات کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے اور اس کے احکام کی تابعداری کر رہی ہے۔ اسی طرح خود انسان بھی اپنی طبیعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔ اس تابعداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی اختیاری اور اخلاقی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بن کر رہے۔ اس وجہ سے جو نظام انسان کو بااقتدار اور خود مختار تسلیم کرتا ہو وہ حقیقت واقعی کے خلاف ہے اور حقیقت کے خلاف چلنے کا نتیجہ خود اپنا نقصان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انسان کا صحیح مقام تو یہی ہے کہ وہ بندہ ہونے کے لحاظ سے اس دنیا میں اپنے آپ کو خلیفہ کی حیثیت میں سمجھے اور اصل مالک کی ہدایت کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے دین نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بن کر زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اقتدار اعلیٰ نہ مانیں

> "نظام خلافت اس اصول پر مبنی ہے کہ انسان نہ آزاد ہے نہ خود مختار' نہ اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے نہ قانون ساز بلکہ پیدائشی طور پر بندہ ہے اور بندے کی حیثیت سے ہر کام مالک کی اطاعت اور اس کے قانون کے مطابق کرنا ہے"

اور نہ کسی کے لئے حق قانون سازی تسلیم کریں۔ چنانچہ ہم اپنے دین کے احکام کی رو سے بھی مجبور ہیں کہ اپنا اجتماعی نظام خلافت کی بنیاد پر قائم کریں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تمام سیاسی مفکرین نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اقتدار اور اختیار ہمیشہ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور کلی اقتدار کلی برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس ہستی کے سوا کائنات میں اور کوئی مخلوق اقتدار اعلیٰ کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس لئے نظریہ خلافت ہی انسان کو مکمل بگاڑ کی طرف جانے سے بچا سکتا ہے ورنہ اقتدار کا غلط پندار بہرحال گمراہی کی طرف لے جائے گا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ غیر مسلم اگر اپنی جہالت کی بنا پر ادھر ادھر بھٹکتے رہیں اور ناکام تجربوں کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے رہیں تو چنداں تعجب کی بات نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بعض تجربات میں اپنے آپ کو کامیابی حاصل کرتا ہوا پائیں۔ لیکن مسلم امت کے لئے نظام خلافت کو چھوڑ کر کسی اور نظام کو اپنانا اس لئے بھی ممکن نہیں ہے کہ نظام خلافت ہی سے یہ امت مانوس ہے۔ اس کا مزاج اسی نظام سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام خلافت کو چھوڑ کر مسلم امت میں مغرب کے طرز پر جمہوری نظام قائم کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں' وہ سب ناکام ہوئی ہیں کیونکہ امت مسلمہ کا مزاج اس دوسرے نظام سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد بھی اسی نظام خلافت کو قائم کرنا تھا ورنہ غیر منقسم ہندوستان کی طرح اگر پاکستان میں بھی مغربی جمہوری نظام ہی قائم ہونا تھا تو پاکستان بنانے کا کیا فائدہ تھا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی عوام کا مطالبہ بھی یہی رہا ہے۔ اگرچہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے عوام کے اس مطالبے کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر مغربی جمہوریت میں

اسلام کی پیوند کاری کے ناکام تجربے ہی کرتی رہیں۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں تقریباً نصف صدی کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مغربی جمہوریت قائم کرنے کی ہر کوشش کا انجام آمریت یا مارشل لاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس طویل تجربہ کے بعد ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ مغربی جمہوری نظام ہماری امت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اس کو مسلط کرنے کی ہر کوشش بحران کا سبب بنی ہے اور بنتی رہے گی۔

نظام خلافت کی تائید میں ہم نے بالاختصار جو دلائل اوپر کی سطور میں بیان کئے ہیں ان کو سن کر بالعموم تعلیم یافتہ حضرات ان کی تردید کرنے کے بجائے نظام خلافت کے مطالبہ کرنے والوں کو زچ کرنے کے لئے ان کے سامنے دو مطالبات رکھ دیتے ہیں اور ان مطالبات کا معقول جواب ملنے تک نظام خلافت کے مطالبے کو ناقابل عمل سمجھ کر اسے نظر انداز کر دینے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں۔

ان میں سے پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ نظام خلافت کا خیال تو بہت اچھا ہے مگر یہ نظام صدیوں سے قائم نہیں ہے۔ اب یہ نظام کیسے قائم ہوگا؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ خلافت کی شرائط کیا ہیں۔ انتخاب کا طریقہ کیا ہے۔ شوریٰ کیسے قائم ہو گی۔ خلیفہ اور شوریٰ کے درمیان فرائض اور اختیارات کی تقسیم کس طرح ہو گی۔ نظام وحدانی (Unitarian) ہو گا یا وفاقی (Federal) ہو گا یا میثاق (Confederal) ہو گا۔ عدلیہ کے فرائض و اختیارات کیا ہونگے۔ فوج اور سول سروسز کا نظام کیا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

بالعموم نظام خلافت کا مطالبہ کرنے والا ان سوال کرنے والوں کی نیک نیتی پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کی بحث میں الجھ جاتا ہے اور پھر یہ حضرات اس کی بتائی ہوئی تفصیل میں مین میخ نکالنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اصل مطالبہ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور بحث دوسری وادیوں میں بھٹک جاتی ہے۔

اس طرح بعض حضرات نیک نیتی کے ساتھ اور اکثر حضرات نظام خلافت کے مطالبہ سے جان چھڑانے کے لئے خلوص کے بڑے مظاہرے کے ساتھ یہ سوال کرتے ہیں کہ نظام خلافت کے اندر ان مسائل کا حل کیا ہو گا جن مسائل میں آج لوگ مبتلا ہیں۔ چنانچہ جنرل (ریٹائرڈ) مرزا اسلم بیگ نے اپنے ایک خصوصی خط میں یہ سوال ان الفاظ میں اٹھایا ہے "آپ سے میری گزارش ہے کہ خلافت راشدہ کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی اصلاح کی عملی تدابیر تجویز فرمائیں۔ صرف نیک خواہشات سے بات نہیں بنے گی۔ حقائق کی دنیا میں مسائل کا حل عملی اور سائنسی انداز میں تلاش کرنا از بس لازم ہے۔ مجھے آپ کے تحقیقی مقالے کا انتظار رہے گا"۔

میں ترتیب تبدیل کرتے ہوئے اس دوسرے سوال کا جواب پہلے دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس جواب سے پہلے سوال کا جواب بھی سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ ایک سیاسی نظام یا اقتصادی نظام جس قسم کے مسائل پیدا کرتا ہے ان کا حل کسی دوسرے نظام سے طلب کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک شخص کسی زمین میں گندم کی فصل اگانے کو نامناسب سمجھتا ہو اور زمین یا آب و ہوا کے لحاظ سے اس فصل کے بجائے کوئی دوسری فصل اگانے کا مشورہ دیتا ہو لیکن گندم کی فصل اگانے والا شخص اس مشورہ دینے والے سے اگر یہ کہے کہ میں نے گندم کی فصل تو اگانی ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ اسکی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں وہ تمہاری اسکیم کے مطابق کیسے دور کی جاسکیں گی۔ ظاہر ہے کہ جواب میں وہ یہی کہے گا کہ بندہ خدا میں جس فصل کو اگانے کے لئے کہہ رہا ہوں اگر تم اسے کاشت کرو گے تو اس کے اندر یہ مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے، جن مسائل کو تم بھگت رہے ہو اور جن کا تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ اسی طرح مغربی جمہوریت نے طالبان اقتدار اور بدعنوان سیاسی رہنماؤں کی جو کھیپ تیار کی ہے یا اس نظام کے تحت غیر منصفانہ تقسیم دولت کی جو لعنت معاشرے پر مسلط ہے یا رشوت اور بدعنوانی کا جو دور دورہ اس نظام میں نظر آ رہا ہے وہ خرابیاں نظام خلافت قائم ہونے کی صورت میں پیدا ہی نہ ہوں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے جو ٹھوس دلائل پر مبنی ہے کہ اگر نظام خلافت قائم ہو جائے اور اس کے تحت اسلام کے معاشی نظام پر عمل کیا جائے تو یہ مسائل سرے سے پیدا ہی نہیں ہوں گے لیکن آپ نظام تو ایک قسم کا چلائیں اور اس کے پیدا کردہ مسائل کا حل کسی دوسرے نظام سے مانگیں تو آپ کا یہ رویہ معقولیت پر مبنی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب پہلے سوال کی طرف آیئے۔ نظام جمہوریت ہی کی طرح نظام خلافت ایک اصول کا نام ہے۔ نظام جمہوریت جس اصول پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ انسان خود مختار اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات خود طے کرنے اور چلانے کا مجاز اور اہل ہے۔ وہ اپنے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لئے اپنی بعض آزادیوں سے دستبردار ہو کر اپنے بعض اختیارات معاہدہ عمرانی کے تحت کچھ لوگوں کو دے دیتا ہے تاکہ وہ عام انسانوں کی مرضی کے مطابق اجتماعی نظام چلائیں۔ اس اصول کو عام فہم انداز میں جمہوریت کی تعریف (definition) کی صورت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"Government of the People, for the pople and by the pople.

یعنی "عوام کے مفاد کے لئے عوام کے نمائندوں کے ذریعے عوام کی حکومت"۔

> "مغربی جمہوریت قائم کرنے کی ہر کوشش کا انجام آمریت یا مارشل لاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس طویل تجربہ کے بعد ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ مغربی جمہوری نظام ہماری امت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، اس کو مسلط کرنے کی ہر کوشش بحران کا سبب بنی ہے اور بنتی رہے گی"

اس اصول کی عملی تفصیلات ہر ملک اور قوم نے اپنی اپنی ضروریات اور اپنے اپنے حالات کے مطابق طے کی ہیں چنانچہ اس جمہوری اصول کی تعبیر امریکہ میں کچھ اور ہے اور برطانیہ میں کچھ اور، اسی طرح فرانس، اٹلی، بھارت، آسٹریلیا، سوئیزرلینڈ، کینیڈا وغیرہ ممالک میں، ہر جگہ تفصیلات میں بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن ہیں یہ سب جمہوری نظام۔

اسی طرح نظام خلافت اس اصول پر مبنی ہے کہ انسان نہ آزاد ہے، نہ خودمختار نہ اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے نہ قانون ساز بلکہ پیدائشی طور پر بندہ ہے اور بندے کی حیثیت سے اسے ہر کام مالک کی اطاعت اور اس کے قانون کے مطابق کرنا ہے اور مالک نے جو ذمہ داریاں اس پر ڈالی ہیں ان کو خلیفہ کی حیثیت سے ادا کرنا ہے۔

اس اصول کی عملی تفصیلات میں بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے اور چونکہ اسلام عالمی اور ابدی دین ہے اس لئے اس نے چند اصولوں کے علاوہ تفصیلات میں

ہم کو آزادی عطا کی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے اپنے بعد خلیفہ کا معاملہ چند اشارات دینے کے بعد امت پر چھوڑ دیا اور خود کسی کو نامزد نہیں کیا بلکہ ایک محدود اجماع نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا' جس کے بعد امت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس انتخاب کی توثیق کر دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے تجربے' علم اور اہل شوریٰ کے مشورے سے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کے معاملے کو امت کے چھ ممتاز ترین اصحاب کی کمیٹی کے سپرد کر دیا جبکہ حضرت علیؓ کو ان اہل مدینہ نے خلیفہ مقرر کیا جو باغیوں کے مقابلے میں بے بس تھے۔

اس ساری صورت حال سے یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب اور تقرر میں بس ایک اصول تو طے شدہ ہے کہ اسکو امت کا معتمد علیہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس اعتماد کو معلوم کرنے کے لئے طریقہ کار کیا اختیار کیا جائے' اس باب میں اسلام نے ہم کو اپنے تمدنی حالات اور ملک کی ضرورت کے لحاظ سے خود فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔ البتہ اس انتخاب میں بھی چند اصولوں کی پابندی لازمی کر دی ہے۔ خلیفہ کے انتخاب میں جو اصولوں کی پابندی لازمی ہے ان میں سے پہلی بات منتخب یا مقرر کئے جانے والے خلیفہ میں خلافت کی اہلیت کی موجودگی ہے اور خلیفہ ہی نہیں اراکین شوریٰ کے انتخاب میں بھی اہلیت کی موجودگی لازمی شرط ہے جبکہ مروجہ مغربی جمہوریت میں اصل اہمیت صرف ووٹوں کی اکثریت کو حاصل ہے۔ اسکے علاوہ مزید کسی اہلیت کی اگر ضرورت ہے تو وہ بلوغ' صحت' عقل' دیوالیہ نہ ہونا اور اخلاقی جرائم میں سزا یافتہ نہ ہونا ہے۔

اسلام نے اہلیت کی جو شرائط رکھی ہیں ان میں بلوغ' صحت جسم و عقل تو جمہوریت میں بھی ضروری سمجھی جاتی ہیں لیکن اسلام کے نزدیک صرف یہ شرائط کافی نہیں بلکہ درج ذیل دوسری شرائط بھی اہلیت کی موجودگی کے لئے ضروری ہیں۔

ایمان و تقویٰ

اگرچہ یہ دونوں قلبی کیفیات کے نام ہیں لیکن ایمان کا اظہار اقرار باللسان سے اور تقویٰ کا اظہار اوامر کی پابندی' نواہی سے اجتناب اور اہل تقویٰ جیسی زندگی گزارنے سے ہوتا ہے۔

علم

کتاب اللہ اور سنت رسول کا اتنا علم کہ وہ ان کو سمجھ کر پیش آمدہ معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کر سکے۔

معاملات سلجھانے کی صلاحیت

حکومت کے معاملات کو سمجھنے اور چلانے کی صلاحیت (اس بارے میں رائے عامہ کو فیصلہ کن ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں)

خود طالب اقتدار نہ ہونا

اگرچہ یہ کوئی علیحدہ شرط نہیں بلکہ تقویٰ کے اندر شامل ہے لیکن دور حاضر میں طلب اقتدار ایک بہت بڑا فتنہ بن چکا ہے اس لئے اس کا علیحدہ تذکرہ ضروری ہے۔

فطری طور پر باصلاحیت افراد میں معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش موجود ہوتی ہے لیکن دیگر فطری خواہشوں کی طرح اسلام نے اس کو حد اعتدال سے بڑھنے سے روکنے کے لئے کئی تدابیر اختیار کی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :

(ا) جو افراد کھلم کھلا طلب اقتدار کی خواہش کریں ان کو اقتدار سے محروم کر دینا' جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اس اصول کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم خدا کی قسم اس ذمہ داری پر ان کو نہیں مقرر کرتے ہیں جو اس کے طالب ہوں رغبت دکھائیں یا اس کے حریص ہوں"۔

(ب) معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کر دینا کہ جن لوگوں کے رویئے سے طلب اقتدار کی جھلک محسوس ہو ان کو معاشرہ پس پشت ڈال دے۔

(ج) افراد کے اندر آخرت کی جواب دہی کا ایسا شعور پیدا کرنا کہ وہ طلب اقتدار کی خواہش کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں۔

مذکورہ بالا شرائط اہلیت کو اور بالخصوص طالب اقتدار نہ ہونے کی شرط کو اسلامی ریاست کے انتخابی قوانین میں موثر حیثیت سے شامل کرنا ہو گا۔

اسلامی خلافت کے نظام میں ایک امتیازی اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ اس کے اندر طلب اقتدار کے لئے سیاسی اور معاشی پروگرام کے نام پر پارٹیاں بنانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی نظام زندگی میں پارٹی بازی کی اساس اس فلسفہ حیات پر ہے جو "تنازع للبقاء" اور "بقاء الاصلح" کے اصولوں پر مبنی ہے' جو فلسفہ حیات اور طاقت ور کو باقی رہنے کا حق عطا کرتا ہے اور جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی نظام سیاست میں پارٹی کیونکہ حصول اقتدار کا ذریعہ ہے اس لئے اس کے ساتھ وفاداری کو وہی درجہ دیا گیا جو جاہلیت کے دور میں قبیلے کے ساتھ وفاداری کو حاصل تھا۔ یعنی یہ کہ "اپنی پارٹی کا ساتھ دو خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر اور خواہ تمہارا ضمیر ساتھ دے یا نہ دے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے اصول اسلامی تعلیمات کی ضد ہیں کیونکہ

(ا) اسلام کا نظام اجتماعی ضعیف کو قوی تر قرار دیتا ہے اور اس کو اپنے سیاسی اور قانونی نظام میں خصوصی ترجیح (weightage) دیتا ہے تاکہ قوی اس کو مٹا نہ سکے۔

(ب) وہ ہر زندہ رہنے والے کو لازمی طور پر "موزوں تر" (اصلح) نہیں قرار دیتا۔ چنانچہ گندے اور ناپاک افکار نیز اشیاء کے محض وجود کو اچھا قرار دینے کو جائز نہیں سمجھتا۔ (ولو اعجبک کثرۃ الخبیث)

(ج) اسلام ہر شخص کے لئے لازمی ٹھہراتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنے ایمان اور ضمیر کے مطابق چلے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے قوانین کو بھی ناپسند کرتا ہے جو انسان کو اس کے ضمیر کے خلاف چلنے پر مائل کرنے یا مجبور کرنے کا سبب بنیں۔ مثلاً اپنی پارٹی کے خلاف رائے دینے سے رکنیت سے محروم ہو جانا۔

(د) وہ صرف اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے اور زمین پر اسی کا اقتدار قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کو مطلوب و مقصود قرار دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی ریاست کے نظام انتخاب میں افراد یا پارٹیوں کے لئے امیدواروں کا دروازہ کسی طرح بھی نہیں کھولا جا سکتا۔ اس کے بجائے ایسے انتخابی قوانین اور ایسا ماحول بنانے کی ضرورت ہے کہ جس میں صالح قیادت خود بخود ابھر کر سامنے آئے' جس کی عملی تربیت کی بہترین مثال نماز باجماعت کے لئے امام کا تقرر یا انتخاب ہے کہ کوئی شخص خود امیدوار امامت نہیں ہوتا لیکن اسلامی جماعت اہل تر کو خود امامت کے لئے آگے بڑھا دیتی ہے۔ اسی طرح ریاست کی شوریٰ کے اندر بھی مستقل نوعیت کی گروہ بندی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کو مستقلاً حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں تقسیم کر دینا اسلام کے نظام سیاست میں ایک ایسا اجنبی تصور ہے جو قدم قدم پر اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق تو

(ا) اپنے حکمرانوں کے ساتھ خیر خواہی کا تعلق دین کا تقاضا ہے جبکہ مغربی جمہوریت میں حزب اختلاف کا اصل فرض ہی یہ ہے کہ حزب اقتدار کو کسی نہ کسی طرح حکومت سے محروم کر دے۔

(ب) ایمان و ضمیر کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان اور ہر رکن شوریٰ کا فرض ہے مگر مغربی جمہوریت میں آدمی پارٹی کے فیصلے کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔

(ج) اسلام میں نجویٰ یعنی خفیہ کوشش کے ذریعہ اپنے حمایتی تلاش کرنا جائز ہے جبکہ مغربی جمہوریت میں یہ عمل معروف اور پسندیدہ۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ انتخابات کے بارے میں دیگر تفصیلات بڑی حد تک اجتہاد کے مطابق طے کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ جن تفصیلات میں خلیفہ اور ارکان شوریٰ کی میعاد' ان کو معزول کرنے کا طریقہ' اسلامی ریاست کے مختلف یونٹوں کا نظام اور صالح قیادت کو ابھارنے کے لئے ضروری انتخابی قوانین وغیرہ شامل ہیں۔

دور حاضر میں بعض جماعتوں نے اسلامی خلافت کے مطالبے کی مقبولیت کو دیکھ کر اس کو بطور نعرہ اختیار کر لیا ہے اور اس نعرے کو عنوان بنا کر وہ اپنا سیاسی و اقتصادی منشور پیش کر رہی ہیں۔ ان کے منشور کی بہت ساری باتیں اسلامی تعلیمات پر مبنی ہوں گی لیکن بہت ساری باتیں مصالح مرسلہ کے ذیل میں آتی ہیں' جن میں امت کو مصلحت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہے مثلاً یہ کہ مرکزی حکومت کے ماتحت صوبے ہوں یا نہ ہوں اور اگر ہوں تو کس اساس پر قائم کئے جائیں' کتنے بڑے ہوں اور کتنی تعداد میں ہوں وغیرہ' امور ایسے ہیں جن میں امت کو کسی ایک بات کا پابند نہیں کیا گیا۔ اس قسم کے سیاسی و اقتصادی منشور کے ساتھ جو پارٹیاں نظام خلافت کا نعرہ لگا رہی ہیں' وہ درحقیقت شعوری یا غیر شعوری طور پر نظام خلافت کے مطالبے کو پس پشت ڈالنے کی ذمہ دار ہیں۔

ہماری سیاسی تاریخ میں اس کی دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی مثال کانگریس کی ہے جس نے آزادی ملنے کے بعد کے دور کے لئے ملک کے دستور کا ایسا تفصیلی نقشہ پنڈت موتی لعل نہرو کے تیار کردہ خاکے کی صورت میں پیش کیا جو "نہرو رپورٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کی تمام اقلیتیں اور بالخصوص مسلمان آزاد ریاستوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور یہی بے اطمینانی آگے چل کر مطالبہ پاکستان کی بنیاد بنی۔

دوسری مثال مسلم لیگ کی ہے کہ اس نے مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کا مطالبہ کیا جو مطالبہ پاکستان کے نام سے مشہور ہوا مگر قائد اعظم نے پاکستان کے دستور کی تفصیلات بیان کرنے سے ہمیشہ گریز کیا یا مبہم جوابات پر اکتفا کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تفصیلات بیان کرنے سے یہ مطالبہ اختلافات کی نذر ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ "خلافت" کی بنیاد پر ریاست قائم کرنے کے کسی داعی کو غیر ضروری تفصیلات میں نہیں جانا چاہئے۔ بالخصوص جن معاملات کو اسلام نے ہمارے اجتہاد اور مشاورتی فیصلوں پر چھوڑ دیا ہے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ خود اپنی طرف سے کر دینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل دعوت (یعنی خلافت) کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور آدمی ضمنی مباحث میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ OO

یہ بلندی' یہ پستی

تحریر : محمد علی شہاب - اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

کراچی میں قتل : کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں میں گزشتہ تین سالوں میں ۲۲ ہزار افراد قتل ہو چکے ہیں' ۲۸ ہزار زخمی ہوئے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جبکہ بچے اور عورتیں بھی ان میں شامل ہیں۔ ۲ لاکھ گرفتار ہوئے۔ ان میں سے ۳۵ ہزار کے خلاف سنگین جرائم پر مبنی مقدمات درج ہوئے' باقی ماندہ کو ایک سے تین ماہ تک اذیت ناک تفتیش کے مراحل سے گزرنا پڑا۔

بیروزگاری : اس وقت ۷۵ لاکھ افراد روزگار کے متلاشی ہیں۔ ۱۹۹۸ء تک صرف تعلیم یافتہ بے روزگار افراد ۲۵ لاکھ سے تجاوز کر جائیں گے۔ کراچی میں ہر سال ۳۰ ہزار نوجوان بے روزگاروں کی صف میں شامل ہوتے ہیں۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق ہر سال ۵ تا ۱۰ لاکھ مزدوروں کا بے روزگاروں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی تک پاکستان کی کل آبادی کا ۲۳ فیصد بے روزگار مزدوروں پر مشتمل ہو گا۔

بیرونی قرضے : پاکستان بیرونی ممالک کے ۲۱ اعشاریہ ۵۵۵ بلین ڈالر کا مقروض ہے جو موجودہ شرح کے حساب سے ۶۶۸۰۰ کروڑ (۶۷ ارب کے لگ بھگ) بنتے ہیں۔ پاکستان کی کل سالانہ آمدنی ۱۵۵۴۰۰ کروڑ ہے۔ اس طرح بیرونی قرضے موجودہ کل سالانہ آمدنی کا ۴۳ فیصد بنتے ہیں۔

سٹینڈنگ کمیٹیاں : قومی اسمبلی اور سینٹ کی سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینز کے لئے جنہیں وزراء کے برابر مراعات حاصل ہوں گی ۵۰ ملین روپے کی لاگت سے ۵۸ نئے ماڈل کی کاریں درآمد کی گئی ہیں۔

اصطبل خانہ : وزیر اعظم ہاؤس میں قائم اصطبل خانہ میں ۸۰ نہایت قیمتی اعلیٰ نسل کے گھوڑے موجود ہیں' جن میں سے بعض کے لئے ایئر کنڈیشنڈ کمروں کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

الذوالفقار : آئی۔ ایس۔ آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل صاحب کا کہنا تھا کہ ایک موقعہ پر پاکستان میں ۶ ہزار بھارتی تربیت یافتہ الذوالفقار کے دہشت گرد شمار کئے گئے تھے۔

("The Universal Message" : بشکریہ)

ملی یکجہتی کونسل کو اپنے مقاصد کا دائرہ بڑھانا ہو گا

دینِ محمد کے داعیوں کا اجلاس---فائیو سٹار ہوٹلوں میں!!!

علماء کے موجودہ کردار نے معاشرے میں ان کا رعب و دبدبہ ختم کر دیا ہے

معروف عالمِ دین مولانا راحت گل مدظلہ کی ملی یکجہتی کونسل کے اجلاس میں گزارشات و تجاویز

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

صدر محترم اور معزز اراکین ملی یکجہتی کونسل

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

گزشتہ ماہ مارچ میں میرے کرم فرما حضرت مولانا سمیع الحق صاحب نے مجھے فون پر بتایا کہ علماء امت کے اتحاد کی غرض سے ایک اجلاس بمقام اسلام آباد بلایا گیا ہے' آپ بھی اس اجلاس میں شرکت کریں۔ میں وقت مقررہ پر اسلام آباد پہنچا' لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایک فوری ضرورت کی وجہ سے مجھے گھر واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد ۲ ماہ تک بیرون ملک سفر پر رہا' ملی یکجہتی کونسل کی تشکیل کی خبر ملی' میں جہاں جہاں گیا' ہر جگہ علماء پاکستان کے اتحاد کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۴ جولائی کو واپس ہوا تو ہمارے ادارہ مرکز علوم اسلامیہ' مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذ شریعت کے مسئلہ پر کونسل کا اجلا ہو رہا تھا۔ پہلی بار کونسل کے اس خصوصی اجلاس میں شریک ہوا۔ چند ہی روز میں حکیم محمد سعید صاحب کی طرف سے قائم کردہ مجلس شوریٰ میں رکن شوریٰ کی حیثیت سے پاکستان کے بجٹ پر اظہار خیال کی دعوت ملی' جو ۱۷ جولائی کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل پشاور میں منعقد ہوئی تھی۔ اب میں عالی مرتبت حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ان کی دعوت پر پہلی بار اکابر ملت کے اس اہم اجلاس میں شریک ہو رہا ہوں۔

میر مجلس! چونکہ اس اجلاس میں اہل علم و دانش اور صاحبان فہم و فراست تشریف فرما ہیں' لہٰذا اشارات و کنایات میں چند گزارشات پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی گزارش : ملی یکجہتی کونسل یقیناً ایک غیر سیاسی تنظیم ہے' بجا اور درست! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کونسل میں شامل اکثر جماعتیں سیاسی ہیں' اس لئے سیاست سے الگ تھلگ رہا بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہر جماعت کے اپنے اپنے تقاضے ہیں' جو ایک دوسرے سے قریب بھی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی۔ اگرچہ اس کونسل کا انتخاباتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن زود یا بدیر یہ معرکہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے تاکہ کونسل عین وقت پر کسی ذہنی انتشار سے دوچار نہ ہو جبکہ حکمران جماعت نے ابھی سے انتخابی معرکہ آرائی کی تیاریاں شروع کر لی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملی یکجہتی کونسل تاریکی میں روشنی کی کرن ضرور بنی ہے لیکن اس کو مشعل راہ بھی بنانا ہے۔ کیونکہ اس وقت قوم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ لیکن اسے کوئی بے لوث قیادت نظر نہیں آتی' اور یہ قیادت صرف ملی یکجہتی کونسل کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے۔

دوسری گزارش : میں جانتا ہوں کہ میری اس گزارش کو بعض حضرات غیر ضروری اور بے محل سمجھیں گے' لیکن میری دانست میں اس مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک اس وقت مختلف بلکہ متضاد راہوں پر چل پڑے ہیں۔ ملی یکجہتی کونسل میں شامل جماعتوں کے کسی نہ کسی مسلک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہیں' مگر ان میں ہر ایک کے فکری راستے جدا جدا ہیں۔ اندریں حالات اس کونسل کو بھی برقرار رکھنا اور ان تعلقات کو بھی نبھانا۔

> **"اگر اب بھی ہم اپنی اپنی جماعتی وابستگی کے محدود دائروں سے نکل کر ملت اسلامیہ کے عالمگیر مفاد بلکہ خود اپنی بقا اور عزت و ناموس کا تحفظ نہ کر سکے تو مصر' شام' عراق' لیبیا' الجزائر اور ترکی میں سیکولر حکومتوں نے علماء اور دینی مدارس کا جو حشر کیا ہے' اس سے بھی بدتر انجام سے ہم دوچار ہوں گے"**

در کف جام شریعت در کف سندان عشق
ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سنداں باختن

لہٰذا اس نازک مسئلہ پر بھی اراکین کونسل کے علم و تدبر اور فراست و بصیرت کا امتحان ہو گا۔

تیسری گزارش : ماضی قریب تک علماء اور دینی جماعتوں کا ایک رعب تھا' ایک دبدبہ تھا' جس سے باطل قوت لرزہ براندام رہتی تھی مگر اب وہ صورت حال نہیں رہی۔ وہ خوف جاتا رہا۔ نوبت یہاں تک

پہنچی کہ اب تو علماء کو منبر پر خطبہ دیتے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ان پر قتل' بغاوت اور قانون شکنی کے مقدمات قائم کئے جاتے ہیں' جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں اور رسوا کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟ سنئے :

جس گیند میں ہوا بھری ہو' اسے جس قدر قوت سے دبایا جائے گا اسی قدر وہ بلندی پر اچھل جائے گا۔ اگر کوئی شخص اس پر پاؤں رکھ کر دبائے تو وہ شخص دھڑام سے گر جائے گا اور گیند صاف نکل جائے گا۔ لیکن اگر اس گیند سے ہوا نکل جائے تو وہ پاؤں کے نیچے روندا جاتا ہے' مسلا جاتا ہے' پامال کردیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہوا نکل کیسے جاتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خود نشاندہی فرما دی ہے : "وان تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم" اس آیت کریمہ کے منظر و پس منظر سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اور پھر "واصبروا" میں پند و نصیحت بھی آپ سے مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اب بھی ہم اپنی اپنی جماعتی وابستگیوں کے محدود دائروں سے نکل کر ملت اسلامیہ کے عالمگیر مفاد بلکہ خود اپنی بقا اور عزت و ناموس کا تحفظ نہ کرسکے تو مصر' شام' عراق' لیبیا' الجزائر اور ترکی میں سیکولر حکومتوں نے علماء اور دینی مدارس کا جو حشر کیا ہے' اس سے بھی بدتر انجام سے ہم دوچار ہوں گے۔

ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت جو قدرے نرمی ہم سے برتی جارہی ہے' یا ہمیں کچھ مراعات و اعزازات حاصل ہیں' یہ رنگینی ساغر اور فریب نظر کے سوا کچھ نہیں۔ حکمران طبقہ کے خطرناک عزائم آپ سے پوشیدہ نہیں۔

ایک اور بات : اس سے پیشتر ملی یکجہتی کونسل کا اجلاس پشاور کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں اور اب یہ اجلاس بھی پرل کانٹی نینٹل مری کی دلربا فضاؤں میں ہو رہا ہے تو میں تفکرات کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہوں کہ آیا ہم یہ معیار آخر تک برقرار رکھ بھی سکیں گے۔ جبکہ ہمارے ذرائع و وسائل کا دائرہ تنگ اور محدود ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ بڑے بڑے عالی شان محلات میں بیٹھ کر ہم باطل قوت کو مرعوب نہیں کرسکتے بلکہ مساجد اور مدارس میں چٹائیوں پر بیٹھ کر جو فیصلے کئے جائیں گے' اس سے دشمن لرز اٹھے گا۔ زمانہ جدید کے تقاضوں کو ٹھکرا کر سنت نبوی کو مشعل راہ بنانا چاہئے اور "ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا" کی الٰہی ہدایت بھی پیش نظر رہے!

معزز علماء امت : اب آخر میں چند تجاویز پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں :

تجویز نمبر۱ : نہ معلوم کس کافر ادا کی فسوں گری ہے کہ آج ہم نے کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں اور بھارتی ہندوؤں کا مسئلہ سمجھ لیا ہے حالانکہ پورا کشمیر پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ ہمارے ہی ملک کے ایک حصے پر غاصب ۶ لاکھ فوج اتار کر ہمارے کشمیری بھائیوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ لیکن ہم تماشائی بن کر ان کی اخلاقی و سیاسی حمایت کا زبانی خرچ جمع کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ موجودہ حکومت سے تو کسی عملی اقدام کی توقع نہیں کی جاسکتی' مگر تعجب ہے کہ ملی یکجہتی کونسل کے ایجنڈا پر مسئلہ کشمیر نہیں رکھا گیا ہے۔ بہرحال میری تجویز ہے کہ کونسل میں شامل سربراہوں کا ایک وفد مسلمان ملکوں کا دورہ کر کے وہاں کے حکمرانوں کو سمجھائے کہ یہ مسئلہ کشمیریوں اور بھارت کا اندرونی مسئلہ نہیں' یہ بین الاقوامی' بلکہ بین الاسلامی مسئلہ ہے۔ ہندی مسلمانوں کا تحفظ متعصب مشرکین کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں نہیں بلکہ ایک مضبوط پاکستان ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کو تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ مگر پاکستان کا استحکام کشمیر کے بغیر ناممکن ہے۔ امید ہے ملی یکجہتی کونسل کا یہ اقدام دور رس نتائج کا حامل ہو گا جو اخراجات ہم ان ہوٹلوں پر کر رہے ہیں اگر وہ وفود کے دوروں پر خرچ کئے جائیں تو مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔

تجویز نمبر۲ : ملی یکجہتی کونسل پاکستان اور بنگلہ دیش کو قریب لانا بھی اپنے منشور میں شامل کرے' جس کے لئے دونوں طرف سے زبردست طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ نیز محصور پاکستانیوں کا مسئلہ بھی زیر غور لایا جائے کیونکہ انہوں نے پاکستان کے لئے بے شمار قربانیاں دی ہیں۔

تجویز نمبر۳ : ربیع الاول کا مبارک مہینہ شروع ہے۔ ملی یکجہتی کونسل ملک کے طول و عرض میں سیرت کانفرنسوں کا ایک پروگرام بنائے' جس میں رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے مجاہدانہ کارناموں' سیاسی' اقتصادی تعلیمات اور ان کے نظام حکومت پر تقاریر ہوں تاکہ عوام کے اندر پیغمبر اسلامؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے سیاسی شعور پیدا ہو جائے۔

تجویز نمبر۴ : اس وقت ملک میں ایسے بااثر علماء و مشائخ موجود ہیں' جن کے ساتھ مسلمانان پاکستان عقیدت رکھتے ہیں اور وہ اس کونسل میں شامل نہیں' وقت کا تقاضا ہے کہ ان کو بھی ملی یکجہتی کونسل میں شامل کرنے یا کم از کم ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

> **"ماضی قریب تک علماء اور دینی جماعتوں کا ایک رعب تھا' ایک دبدبہ تھا' جس سے باطل قوت لرزہ براندام رہتی تھی مگر اب وہ صورتحال نہیں رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب تو علماء کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے گرفتار کرلیا جاتا ہے' ان پر قتل' بغاوت اور قانون شکنی کے مقدمات بنائے جاتے ہیں --- ایسا کیوں ہے؟"**

قائدین امت! آج میں سردار کونینؐ کے باغ کے ان رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اپنے اندر ۷۵ سال کی عمر میں ۲۵ سالہ جوانی کے ولولے موجزن پاتا ہوں لیکن اس وقت جو خطرناک حالات ہمارے سامنے ہیں اور چاروں طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آتش سوزاں کے شعلے بھڑکائے جارہے ہیں' اس کی تپش سے اپنے قلب کی کیفیت میں عجیب سرور پارہا ہوں۔

آگ ہے ' اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

☆☆☆☆

فرمودۂ اقبالؒ

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!
وہ دل ' وہ آرزو باقی نہیں ہے!
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے!

☆ ☆

جاگیرداری نظام کا خاتمہ؟ ... مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟

صوبوں کی تشکیل نو پاکستان کو منتشر نہیں متحد کرے گی!

ہماری دینی سیاسی جماعتیں بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ سیاسی اتحاد کے ذریعے اسلام لانا چاہتی ہیں!

جناب سید سبط الحسن ضیغم کے ایک مضمون میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جواب میں ہمارے قلمی معاون جناب محمد سمیع کی تحریر

بے شک پاکستان میں مروج جاگیرداری نظام کو دفن کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ عوام کے دلوں کی آواز ہے جو اس کے نتائج بد بھگتنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی یہی چاہتے ہیں۔ یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے جس قدر بلند آہنگی کے ساتھ اس نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے یہ انہی کا حوصلہ ہے ورنہ دارالعلوموں اور خانقاہوں سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند ہوتی سنائی نہیں دیتی۔ وجہ اظہر من الشمس ہے کہ دارالعلوموں اور خانقاہوں کے وجود میں ایک موثر رول اسی جاگیردار طبقہ کا ہے جو اپنی کارستانیوں کا مداوا اس قسم کی نیکی میں سمجھتا ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ ایک جماعت کے سربراہ نے بڑا حوصلہ کیا تو کاروان دعوت و محبت کے دوران یہ نعرہ بلند کیا کہ "دور ہٹو سرمایہ دارو پاکستان ہمارا ہے' دور ہٹو جاگیرداروں پاکستان ہمارا ہے اور دور ہٹو انگریز کے یارو پاکستان ہمارا ہے" لیکن وہ جماعت چند ہی دنوں بعد اس اتحاد میں شامل ہو چکی تھی جس میں نواز شریف جیسے بڑے سرمایہ دار' چودھری شجاعت حسین جیسے جاگیردار اور غلام اسحاق خان جیسے انگریز کے یار شامل تھے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ نعرہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے لگایا گیا تھا حالانکہ دینداروں کو' خصوصاً اللہ تعالیٰ کی اس وعید سے لرزنا چاہئے کہ "تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں"۔ عام سیاست دان بھلا اس نظام کے خلاف آواز کیوں بلند کرے جبکہ ان کی اکثریت اسی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے طبقہ پر مبنی ہے۔ حال ہی میں مشہور ماہر معاشیات اور سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کا بیان اخباروں میں شائع ہوا ہے' جس میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ ان سے وزارت صرف اس لئے چھین لی گئی کہ انہوں نے پانچ فیصد زرعی ٹیکس لگانا چاہا تھا۔

ایسے میں ڈاکٹر اسرار احمد جاگیرداری نظام کے بارے میں کوئی تجویز پیش کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی نیت پر شک کیا جائے' محترم و مکرم سید سبط الحسن ضیغم کو اس پس منظر پر غور کرنا چاہئے تھا جس میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے اور جبکہ یہ تجویز "سنہ الخلفاء الراشدین المہدیین" میں سے ایک خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ اگر تو ڈاکٹر اسرار احمد کو جاگیرداروں کا قرب حاصل ہوتا یا انہوں نے اپنے اداروں کے لئے کبھی ان سے مالی تعاون کے لئے دست سوال دراز کیا ہوتا تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی۔ اس کے برعکس ضیاء الحق مرحوم کی اس مجلس شوریٰ میں جس میں جاگیرداروں کی ایک معتدبہ تعداد شامل تھی' اس تجویز کو پیش کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ ایک "Land Reform Commission" قائم کیا جائے جس کے ذریعے یہ معاملہ طے کیا جا سکے لیکن "نظام پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو" ہر دور میں بالادستی انہی جاگیرداروں کو حاصل رہی ہے تو ضیاء الحق مرحوم کی آمرانہ حکومت اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتی تھی اور وہ اس تجویز پر عمل کر کے اپنی حکومت کو خطرے میں کیسے ڈال سکتے تھے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاگیرداری نظام کو دفن کرنے کی کیا صورت ممکن ہے؟ میرے علم کی حد تک اس جمہوری نظام کی موجودگی میں جس کی سرپرستی کرنے میں دانشور' علماء' سیاست دان ایک دوسرے سے مسابقت میں مصروف ہیں' ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جمہوری نظام کے تختے میں ہمیں جو سیاست داں ملے ہیں ان کی اکثریت جاگیرداروں اور وڈیروں پر مشتمل ہے۔ وہ کب چاہیں گے کہ اپنی جاگیرداری کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دیں۔ جاگیرداریاں دفن کرنا تو دور کی بات ہے' ہماری اسمبلیاں تو اب تک "بیچارے" جاگیرداروں پر زرعی ٹیکس بھی عائد نہ کر سکیں۔ پھر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زمینیں ان کے آباؤ اجداد کو انگریزوں سے وفاداری کے نتیجے میں تحفے میں ملی ہیں تو کیا ہوا "قبضہ سچا' دعویٰ جھوٹا" کا قانون تو ملک میں موجود ہے۔ لہٰذا کس کی جرات ہے کہ وہ ان کی جاگیروں کو ان سے چھین سکے؟ کسی انقلاب ہی کے ذریعہ ایسا ممکن ہے۔ فوجی انقلابات اور سوشلزم کے انقلاب کے نتیجے میں تو ہم ایسا نہ کر سکے' اب ایک اسلامی انقلاب ہی ہے جس پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں ایک دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی انقلاب آئے تو کیسے؟ اکثر علماء دین سیاست سے دور ہیں' جبکہ کچھ علماء سیاست کے مروجہ انتخابی نظام کے تحت جمہوریت کے کھیل میں مصروف ہیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کے رونما ہونے تک کیا ہم موجودہ صورتحال سے مصالحت کر لیں؟ اگر نہیں تو ڈاکٹر اسرار احمد کی تجویز پر اہل علم کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ اگر محترم سید سبط الحسن ضیغم صاحب اس سے بہتر تجویز "اس بلی کے گلے میں گھنٹی" باندھنے کے لئے قوم کے سامنے پیش کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا تو اھلاً و سہلاً!!

صوبوں کی تشکیل نو کے بارے میں تو سید سبط

الحسن ضیغم صاحب کے خیالات پر واقعتاً داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر پاکستان کو سترہ صوبوں میں تقسیم کرنے کی وجہ سے ملک کے سترہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانے کی منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موجودہ پاکستان چار حصوں میں تقسیم ہے۔ حالانکہ الحمدللہ پاکستان کے چاروں صوبے وفاق کی ایک اکائی کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے پاکستان ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ فاضل مضمون نگار کو صوبوں کی تشکیل پر کوئی اعتراض ہے تو اس کے لئے ٹھوس دلائل مہیا کرتے۔ بہرحال وہ صاحب علم ہیں' انہیں معلوم ہے کہ صوبوں کی تشکیل نو کا معاملہ نہ صرف چند سیاسی جماعتوں کے منشور میں رہا ہے بلکہ اب تو سیاست دان حضرات بھی اس کا اظہار برملا اخبارات و جرائد کو جاری بیانات کے ذریعے کر رہے ہیں۔

> "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاگیرداری نظام کو دفن کرنے کی کیا صورت ممکن ہے' اس جمہوری نظام کی موجودگی میں جس کی سرپرستی میں دانشور' علماء اور سیاست دان ایک دوسرے سے مسابقت میں مصروف ہیں' ایسا ہونا ممکن نہیں"

ڈاکٹر اسرار احمد صدارتی نظام کو نظام خلافت سے قریب تر سمجھتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے اپنے دلائل بھی لوگوں کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ویسے بھی موجودہ پارلیمانی نظام سے ملک کے ٹکڑے ہی ہوئے ہیں اور ملک موجودہ ہی نہیں بلکہ مستقل سیاسی عدم استحکام بھی اسی نظام کی بدولت ہے۔ اصل میں جمہوریت کی زلف گرہ گیر کے ہم اس قدر اسیر ہو چکے ہیں کہ "اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے" والی کیفیت ہمارے دانشوران و قائدین پر پوری طرح طاری ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسی بات کو سننے کے لئے تیار ہی نہیں' خواہ وہ نظام خلافت ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال ڈاکٹر اسرار احمد کا گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس ملک کے تمام مسائل کا حل نظام خلافت کے قیام میں ہے جس کے لئے وہ سرگرم عمل ہیں۔ (باقی صفحہ ۲۲ پر)

اقتدار احمد مرحوم کی یاد میں

پروفیسر اسرار احمد سہاوری

شخصیت میں تھے گرچہ کوہ وقار — موت نے کر لیا انہیں بھی شکار
عظمتوں کے رہے وہ آئینہ دار — تھا قلم ان کا ابرِ گوہر بار
زندگی تھی رہین دیں کے لئے — تھا کلام ان کا نغمہائے ہزار
فکر ان کی بلندیوں کی امیں — ذوق عرفاں کے تھے امانتدار
علم و حکمت پہ دسترس ان کو — ذہن ان کا ادب میں تھا فنکار
ان کی ہر بات دلنشیں تھی بہت — ان کی تحریر میں چمن کی بہار
بات میں دلکشی تھی کلیوں کی — نثر ان کی حسین لالہ زار
دین و دنیا کا علم زیرِ نظر — تھا خطابت میں فصلِ گل کا نکھار
عشق نبوی کے تھے وہ حلقہ بگوش — ذوقِ عرفاں کے حسن پر تھے نثار
ان کا اخلاق نکہتوں کا امیں — ہر عمل الفتوں کا آئینہ دار
علم و دانش کی پرورش کی تھی — حسن کردار پر تھے جاں سے نثار
صلح کل اقتدار کا مسلک — خندہ روئی کے تھے خزینہ دار
دل غنی بے نیاز فطرت تھی — ان کی دولت قلندرانہ وقار

یہ دعا ان کے حق میں ہے اسرار
ان کو حاصل ہو جنتوں کی بہار!

بقیہ : حدیثِ امروز

کہ اس کے مالٹے واقعی ریڈ بلڈ ہیں۔ ہمارے منہ سے یہ جملہ معاً نکلا "چل بھائی' نور پیر دا ویلا اے چار درجن دے دیں"۔ بس یہ کہنا تھا کہ دکاندار بولا "بابو جی' نور پیر کا نام لے لیا ہے' یہ مالٹے ریڈ بلڈ نہیں۔ میٹھے سرخ رنگ کا ٹیکہ لگایا ہوا ہے"۔ جب ہم نے چل دینے کو قدم بڑھایا تو دکاندار بولا "بابو جی' آیئے یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ پہچان کیا ہے۔ قدرتی ریڈ بلڈ کا بیج سفید ہی رہتا ہے جبکہ ٹیکے سے بنائے گئے ریڈ بلڈ کے بیج پر سرخ رنگ چڑھ جاتا ہے" اخباری اطلاع کے مطابق چند روز قبل جعلی موبل آئل بنانے والی فیکٹری پکڑی گئی جس میں استعمال شدہ موبل آئل کو بڑے بڑے کڑاہوں میں مقررہ حد تک گرم کرنے کے بعد چھاننے کے بغیر نئے لیبل شدہ ڈبوں میں بھر کر اصلی موبل آئل کے طور پر تھوک میں فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک مقتدر معتبر شخصیت نے اگلے روز یہ انکشاف کرتے ہوئے حیرت زدہ کر دیا کہ ایک ایسے پر قوت ادارے نے جو غلط کاموں کو موقع پر روک دینے پر مامور ہے' نقلی ٹیم اور سیون اپ جیسے مشروبات کی مشین لگا رکھی ہے۔ وہ صاحب ہمیں ساتھ لے جا کر دکھا دینے پر مصر تھے۔ گھروں میں خواتین اکثر جعلی چائے کی پتی' جعلی سرخ مرچ اور جعلی ہلدی کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔ ہم سب اپنے تئیں ان قباحتوں کا کہیں نہ کہیں' کبھی نہ کبھی رونا روتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی ہم نے من حیث القوم یہ بھی سوچا کہ کیا ہم مسلمان بھی ہیں؟ کیا جعلسازی مسلمان کو زیب دیتی ہے؟ تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے بہترین امت ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ اس اعزاز کی لاج تو رکھو!OO

ہماری صحافت مقصدیت سے یکسر عاری ہے!

ماضی کی درخشاں روایات کو ارباب صحافت فراموش کر چکے ہیں!

نظریاتی پس منظر کے حامل اخبارات بھی دوسروں کی تقلید میں زرد صحافت اپنا رہے ہیں

"ندائے خلافت" کے بانی مدیر' مرحوم اقتدار احمد سے معروف صحافی محمد آصف بھلی کا انٹرویو'

جواب ان کی کتاب "چوتھے ستون سے مکالمہ" کا مستقل جزو ہے

✸ آپ نے صحافت کی ابتدا کب اور کیسے کی۔ آپ کی صحافتی تربیت میں کن لوگوں کا حصہ رہا۔ آغاز کار میں کن صحافیوں نے متاثر کیا؟

● میری ابتدائی زندگی تو عام آدمی کی زندگی تھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے سوا کہ میں نے شعور انتہائی چھوٹی عمر میں حاصل کر لیا تھا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی عمر سے دس سال بڑا لگتا ہوں۔ ابتدائی عمر میں تھوڑا سا وقت مجھ پر ذہنی آوارگی کا بھی گزرا ہے۔ اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ میرے خیالات میں وسعت بھی اسی وجہ سے ہے۔ الفاظ کا ایک ذخیرہ بھی میسر آگیا' جو آج میرے کام آرہا ہے۔ جہاں تک صحافت کے آغاز کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ میں سکول ہی کے زمانے سے جماعت اسلامی سے متاثر تھا۔ ہمارا پورا خاندان جماعت اسلامی سے وابستہ تھا۔ میں ہائی سکول کا طالب علم تھا اور اس دوران میں ساہیوال میں روزنامہ "تسنیم" کا نمائندہ تھا۔ ایک مرتبہ مولانا امین احسن اصلاحی ساہیوال میں تشریف لائے۔ انہوں نے وہاں ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ میں ان کی تقریر کی رپورٹ مرتب کی اور وہ رپورٹ ان کی خدمت میں پیش کر دی کہ آپ ایک نظر اس رپورٹ کو دیکھ لیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے میری اس رپورٹ کی بہت تعریف کی اور فرمانے لگے کہ اگر مجھے خود یہ رپورٹ بنانا پڑتی تو میں بھی اس طرح کی رپورٹ بنانہ پاتا۔ اس وقت صحافت سے میرا بہت زیادہ تعلق نہیں تھا۔ پھر میں جب ۱۹۵۹ء میں لاہور آیا اور میں نے لاء کالج میں داخلہ لیا تو میں نے سوچا کہ مجھے جز وقتی کوئی کام کرنا چاہئے۔ میں ملک نصراللہ خان عزیز صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے "تسنیم" میں نیوز ڈیسک پر کام کرنے کا موقع دے دیا۔ کچھ ہی عرصہ گزرا کہ

"میں ایک نیا ہفت روزہ نکال کر درحقیقت اس صدمے کا اظہار کرنا چاہتا تھا جو مجھے موجودہ صحافت کی وجہ سے محسوس ہوتا تھا"

میں نے اخبار میں فکاہی کالم بھی لکھنا شروع کر دیا۔ پھر میں ادارتی نوٹ بھی لکھنے لگا۔ اس سے ملک صاحب کو یہ اندازہ ہوا کہ مجھ میں لکھنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں ہفت روزہ "ایشیا" کی ادارت سنبھال لوں۔ ملک نصراللہ خان عزیز "ایشیا" کے لئے اپنا ایک مضمون دے دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی تمام مواد کی ذمہ داری میرے سر پر تھی۔ میں ہی "ایشیا" کے اداریئے لکھا کرتا تھا۔ دیگر کئی مضامین بھی میرے ہی لکھے ہوتے تھے۔ میں نے خواتین کے لئے بھی "ایشیاء" میں کچھ صفحات مخصوص کر دیئے اور خواتین کے لئے بھی میں خود ہی اپنی بیٹی کے نام سے مضمون لکھا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرے زمانے میں اس پرچے کی اشاعت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ انہی دنوں مجھے ملک صاحب نے کہا کہ تم یہ قانون وغیرہ کا چکر چھوڑو اور کلی طور پر صحافت کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ۔ میں ان کی اس تجویز پر عمل نہ کر سکا اور سات آٹھ ماہ تک عملی صحافت کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد میں نے ایک اور کاروبار اختیار کر لیا۔ میرے اس کاروبار کا صحافت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ مجھے کن صحافیوں سے تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے ملک نصراللہ خان عزیز سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لیکن وہ میرے باقاعدہ استاد نہیں تھے۔ میں نے زیادہ تر جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ہے' ان میں مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا چراغ حسن حسرت' مولانا عبدالماجد دریا آبادی' مولانا عبدالمجید سالک شامل ہیں۔ ان بزرگوں سے براہ راست سیکھنے کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا لیکن ان کی تحریروں سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ایک طرح کا سیلف میڈ صحافی

"مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا' جب بھی لکھا اپنے ضمیر کے مطابق لکھا"

ہوں۔

✸ آپ نے صحافت کی کون کون سی اصناف میں طبع آزمائی کی اور کس صنف میں خود کو زیادہ کامیاب محسوس کیا؟

● خبریں وغیرہ میں بڑی اچھی بنا لیتا تھا۔ اس کے

علاوہ سنجیدہ مضامین لکھنے کی صلاحیت بھی ہیں اپنے اندر پاتا ہوں اور مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں بھی میں نے لکھیں ہیں۔ اپنے سفرنامے کی کچھ اقساط لکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ اس طرح کی تحریریں جس میں مشاہدات ہوں' احساس کی شدت ہو' یہ بھی آسانی کے ساتھ لکھ سکتا ہوں۔ اب میں جب سے ہفت وار صحافت کے میدان میں آیا ہوں تو نئی نئی راہیں میرے سامنے آ رہی ہیں ان پر بھی میں اپنی صلاحیتیں آزما رہا ہوں۔ اب رہی یہ بات کہ میں صحافت کی کس صنف میں زیادہ کامیاب ہوں تو اس کا فیصلہ میں خود نہیں کر سکتا۔ یہ فیصلہ میرے قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

✸ ایک اچھے اور کامیاب صحافی میں آپ کے خیال میں بنیادی طور پر کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

● پہلی بات تو یہ ہے کہ جو شخص اس پیشے کو اختیار کرے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے مفہوم کو مناسب الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اس کے بعد میرے نزدیک تو یہ بالکل ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی نظریے سے وابستہ ہو تاکہ جب وہ لکھے تو اس کا نظریہ اور جذبہ اس کے قلم کو تحریک دے اور اس کو سچ لکھنے اور سچ کہنے پر آمادہ کرے۔ نظریے کے بغیر صحافت کو میں مصنوعی صحافت سمجھتا ہوں اور اس طرح کی بناوٹی صحافت کو پھر آپ سچی صحافت نہیں کہہ سکتے۔ جو صحافی نظریہ ضرورت کے تحت اپنا قبلہ تبدیل کر لیتے ہیں میرے نزدیک وہ صحافی نہیں ہیں۔

نظریئے کے بغیر صحافت کو میں مصنوعی صحافت سمجھتا ہوں' اس طرح کی صحافت کو سچی صحافت نہیں کہا جا سکتا' جو صحافی نظریہ ضرورت کے تحت اپنا قبلہ تبدیل کر لیتے ہیں' میرے نزدیک وہ صحافی نہیں ہیں

✸ آپ نے بہت سارے ہفت وار جریدوں کی موجودگی میں ایک نئے ہفت روزہ کا آغاز کیا ہے۔ اس کی ضرورت آپ نے کیوں محسوس کی؟ آپ کے پیش نظر مقاصد کیا ہیں؟

● مجھے یہ خوب معلوم تھا کہ ہمارے ہاں کے روزناموں نے ہفتہ وار صحافت کا راستہ بند کر دیا ہے اور مجھے پورا احساس تھا کہ لوگ منتظر نہیں بیٹھے ہیں کہ میں ایک ہفت روزہ نکالوں گا اور وہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ میرے دل میں دراصل ایک داغ تھا اور مجھے یہ دیکھ کر صدمہ محسوس ہوتا تھا کہ ہماری صحافت کن راستوں پر چل پڑی ہے۔ میں نے اس سے پہلے جو چند مہینے صحافت میں گزارے تھے' اس وقت تک ہمارے ماضی کے نقوش ہماری قومی صحافت میں باقی تھے' مقصدیت تھی' نظریہ تھا' صحافت کو ایک جہاد خیال کیا جاتا تھا۔ اب وہ باتیں میرے ذہن پر آج بھی نقش ہیں اور جب میں موجودہ صحافت کو دیکھتا تھا تو ایک رنج اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ صلاحیت دے رکھی ہے اور وسائل بھی دے رکھے ہیں تو کیوں نہ میں صحافت میں ان تابندہ روایات کو دوبارہ جاری و ساری کروں جو ہمارے بزرگ صحافیوں نے قائم کی تھیں۔ میں ایک نیا ہفت روزہ نکال کر درحقیقت اس صدمے کا اظہار کرنا چاہتا تھا جو مجھے موجودہ صحافت کی وجہ سے اپنے میں محسوس ہوتا تھا۔

✸ ایک صحافی کی حیثیت سے کیا آپ دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کے قائل ہیں۔ اس تفریق اور امتیاز کی حدود آپ کے نزدیک کیا ہونی چاہئیں؟

● بھلی صاحب! دائیں اور بائیں بازو کا قائل تو ہونا پڑتا ہے کیوں کہ وہ موجود ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ میں دائیں بازو کا آدمی ہوں۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں دائیں اور بائیں بازو میں جو تفریق موجود ہے اسے آپ ختم نہیں کر سکتے۔ ہر آدمی اور ہر جماعت کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے لیکن دائیں اور بائیں بازو کی تفریق سے پریشان وہ ہوتے ہیں جن کا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ ہم ایک دین کے پیروکار ہیں۔ ایک ایسے دین کے جس کا اپنا مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ہم جو کچھ لکھیں گے اسی ضابطہ حیات کی روشنی میں لکھیں گے۔

✸ صحافت کے بجائے اگر آپ عملی سیاست میں حصہ لیتے تو کیا اس طرح آپ زیادہ بہتر طور پر ملک و قوم کی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے؟

● یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھے صلاحیتیں دے رکھی ہیں اور صلاحیتیں ہوں تو وہ ہر جگہ استعمال ہو سکتی ہیں۔ اگر میں سیاست کے میدان میں آؤں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہاں بھی مجھے نمایاں مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں نے سوچ سمجھ کر جو باتیں اپنائی ہیں ان کے لئے اس مروجہ سیاست میں جگہ نہیں۔ اس لئے میں سیاست میں آنے کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔

✸ کیا آپ جس طرح کی صحافت کو ملک میں رواج دینا چاہتے ہیں' اس طرح کے مواقع یہاں موجود ہیں؟

● یقیناً ایسے مواقع موجود ہیں لیکن وہ روز بروز سکڑتے جا رہے ہیں اور اگر میری طرح کے کچھ اور لوگ میدان میں نہ آئے تو شاید یہ مواقع بالکل ختم ہو کر رہ جائیں۔ میں جو مقاصد اور عزائم لے کر صحافت کے میدان آیا ہوں۔ ان مقاصد کو پسند کرنے والے افراد کی تعداد ہمارے معاشرے میں بہت کم ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک میں جلد یا بدیر وہ حلقہ ضرور پیدا ہو جائے گا جو صحافت کی پرانی اور اعلیٰ اقدار کا انتہائی خوشدلی سے خیر مقدم کرے گا۔

✸ کیا آپ کا ضمیر مطمئن ہے کہ ایک صحافی کی حیثیت سے آپ پر جو قومی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں' آپ نے ہمیشہ انہیں پوری دیانتداری سے ادا کیا ہے؟

● اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے یہ اطمینان حاصل ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا' جب بھی لکھا' اپنے ضمیر کے مطابق لکھا اور اس نظریئے کے مطابق لکھا جو اللہ کی توفیق سے میں نے اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اس اعتبار سے میں پوری طرح مطمئن ہوں۔

✸ کیا آپ اپنے نقطہ نظر سے وطن عزیز کی صحافت کی چند نمایاں خامیوں کی نشاندہی کرنا پسند کریں گے؟

● ہماری صحافت کی سب سے نمایاں خامی یہ ہے کہ ہم اپنے دین سے دور ہیں اخبار کی جو رپورٹنگ

"آزاد صحافت صرف وہ ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے جو نفع و نقصان سے بے نیاز ہو جائے"

ہے، اس میں تو پوری طرح دین پر کاربند رہنا مشکل ہے لیکن ہمارے دین کا جو تقاضہ ہے کہ نیکی کو فروغ دیا جائے اور برائی کا تدارک کیا جائے۔ یہ تقاضہ ہمارے صحافیوں کو بھی پورا کرنا چاہئے۔ ہماری صحافت کو دین کے اصولوں سے روگردانی نہیں کرنی چاہئے۔ لوگوں

"ہمارا ایک دین ہے اور اس دین کے بنیادی اصولوں کی پاسداری ہم اہل صحافت کا بھی فرض ہے"

کی اخلاقی تربیت پر توجہ دینی چاہئے۔ یہ کام بدقسمتی سے ہماری صحافت اس وقت انجام نہیں دے رہی۔ ہمارے بیشتر اخبارات اور جرائد غیر شعوری طور پر غیر اسلامی اقدار کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہماری پوری صحافت شعوری طور پر یہ فیصلہ کرے کہ ہمارا ایک دین ہے اور اس دین کے بنیادی اصولوں کی پاسداری ہم اہل صحافت کا بھی فرض ہے۔

✸ آپ کی نظر میں پاکستان کی صحافت کی وہ خوبیاں جنہیں ایک صحافی کی حیثیت سے آپ اپنے لئے سرمایہ افتخار خیال کرتے ہوں؟

● (طویل خاموشی) مجھے اس سوال نے خاصی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں نے صحافت کے اس پہلو کے بارے میں کبھی سوچا نہیں۔ بہرحال ہماری صحافت میں یہ ایک خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ عوام کی مزاج شناس ہے۔ ہمارے صحافی اخبارات اور رسالوں میں پڑھنے کے لئے وہی کچھ دیتے ہیں جو عوام کو پسند ہوتا ہے اور جس سے اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

✸ روزنامہ "جنگ" کی اشاعت پاکستان بھر میں تمام اخبارات سے زیادہ ہے۔ "جنگ" کی اس کامیابی کا تجزیہ آپ کیا کرتے ہیں؟

● "جنگ" کی دوسرے تمام اخبارات کے مقابلے زیادہ اشاعت کو دنیاوی اعتبار سے تو میں کامیابی ہی کہوں گا لیکن اگر کسی شخص کو اپنی عاقبت کی بھی فکر نہ ہو تو میں اسے بہت بڑی ناکامی قرار دوں گا۔ "جنگ" کی خدمات بھی اپنی جگہ پر ہیں۔ اس نے لوگوں کو اخبار پڑھنے کی عادت ڈالی ہے لیکن اس اخبار نے لوگوں کے اندر جو منفی رجحانات پیدا کئے ہیں۔ ہماری اخلاقی اقدار کو جس طرح سے تباہ کیا ہے "جنگ" کے اس کردار کو کوئی ذی ہوش شخص پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

✸ کہا جاتا ہے کہ "نوائے وقت" نے اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے ہر معاملے میں "جنگ" کی تقلید کا رویہ اپنا رکھا ہے اور یوں "نوائے وقت" اپنے اصل مقام اور تشخص سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟

● اگرچہ "نوائے وقت" نے اپنی اشاعت برقرار رکھنے کے لئے "جنگ" کے انداز کو بڑی حد تک اپنا لیا ہے۔ گیٹ اپ کا، لے آؤٹ کا، عورتوں کی تصاویر شائع کرنے کا۔ لیکن "نوائے وقت" کی ادارتی پالیسی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ اس وجہ سے میں "نوائے وقت" کا احترام کرتا ہوں۔ "نوائے وقت" آج بھی ایک سنجیدہ اور معیاری اخبار ہے۔

✸ ہمارے ہاں جو آزاد اخبارات ہیں اور جو ادارے اپنے تئیں آزادی صحافت کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ آپ کے خیال میں وہ کس حد تک آزاد ہیں اور جابر حکمرانوں کے سامنے وہ کس حد تک کلمہ حق کہنے کا فرض ادا کر رہے ہیں۔

● ہمارے ہاں جو ماحول پیدا ہو گیا ہے اور بالخصوص ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور آمریت میں جس طریقے سے آزاد صحافت کو دبانے کی کوشش کی گئی، اس سے یہ صورتحال پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں کی جو صحافت کمرشل ہو گئی ہے وہ ہرگز آزاد صحافت نہیں ہے۔ آزاد صحافت صرف وہ ہوتی ہے اور وہ ہو سکتی ہے جو نفع اور نقصان سے بے نیاز ہو جائے۔ جو صحافت سرکاری اشتہارات کی محتاج ہو وہ آزاد رویہ نہیں اپنا سکتی۔

✸ آپ کو اپنی صحافتی زندگی کے دوران کس صحافی کے فکر و عمل، جرات، بصیرت اور اصول پرستی نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

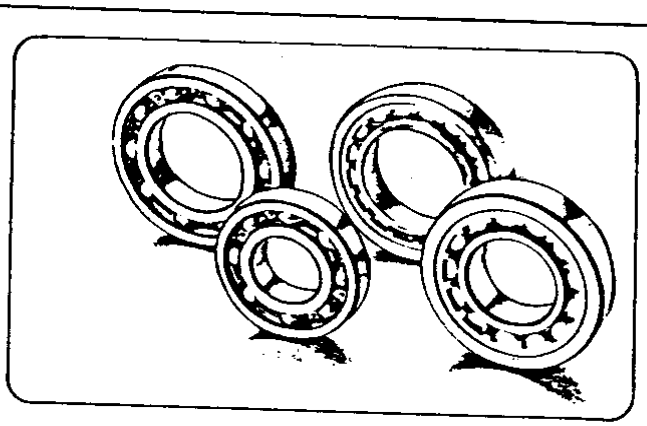

KT **KHALID TRADERS**
IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE
AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

کراچی میں نئے "اوس و خزرج" جنم لے رہے ہیں!

حکومت وقت کراچی میں جو بوئے گی وہی کچھ کاٹے گی!!

نجیب صدیقی

کراچی کے مسائل کا حل.... قرآن کے دامن میں پناہ لینے میں مضمر ہے

کراچی کے مسائل پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا ہے۔ اتنی تجاویز مختلف حلقوں کی طرف سے آ چکی ہیں جنہیں اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ پھر بھی مسئلہ جوں کا توں ہے' آخر ایسا کیوں ہے؟۔

ان اسباب پر بھی جو اس مسئلے کی پشت پر موجود ہیں' اہل الرائے شرح و بسط سے گفتگو کر چکے ہیں۔ مسائل کے درمیان جب "انا" آ جائے تو وہ نہ ختم ہونے والی جنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کراچی کے مسئلے کے حوالے سے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ ایک طرف حکومت اپنے تمام وسائل کے ساتھ تنی کھڑی ہے اور دوسری طرف جو "اسٹریٹ پاور" سے مسلح ہیں وہ ہار ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ہر طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے۔ ایک دوسرے پر الزام عائد کیے جا رہے ہیں اور دونوں گروہ اس سے انکاری ہیں۔ پھر یہ قتل کون کرا رہا ہے؟۔ محاذ آرائی بھی ساتھ ساتھ جاری ہے۔ دشمنی کا شیطان توانا سے توانا تر ہو رہا ہے۔ ہمارے حکمران نتائج سے غافل ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ جنگ آج نہیں تو کل جیت لی جائے گی۔

اگر یہ جنگ حکومت نے جیت بھی لی تو اس کے عواقب کتنے سنگین ہیں اس پر حکومت کی نگاہ نہیں۔ اگر حکومت ٹھنڈے دل سے غور کر لیتی تو اس کے بھیانک نتائج سے خود خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ انجام کار سے غافل آدمی جب اس کے مکافات سے گزرتا ہے تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ گریہ و زاری کرتا ہے مگر یہ گریہ و زاری اس کے کام نہیں آتی۔ اس کا منظر قرآن نے بھی کھینچا ہے کہ وہ لوگ جو آج انکار کی روش پر قائم ہیں اور ہٹ دھرمی سے اپنے غلط موقف پر اڑے ہوئے ہیں' جب وہ آگ کا منظر دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر واپس بھیج دیا جائے تو پھر ہم صالح بن جائیں گے مگر ایسا نہ ہو گا کیونکہ وقت لوٹ کر نہیں آتا۔

حکومت آج جو کانٹے کراچی میں بو رہی ہے جب اس کی کھیتی کل کو لہلہائے گی تو اس وقت ندامت سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ لوگ جو آج ان حالات سے خوش ہیں کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ ٹھیک کر رہی ہے' کل وہی لوگ اس کو تنقید کا نشانہ بھی بنائیں گے۔ نفرت کی کاشت سے محبت کے پھل نہ پہلے کبھی پیدا ہوئے ہیں' اور نہ ہی آئندہ کبھی پیدا ہوں گے۔ آنے والے دنوں کی وحشت ناکی سے طبیعت لرز جاتی ہے۔ حکومت اس وقت ایک خاص طبقے کی نمائندگی کر رہی ہے اور مقابل میں بھی ایک طبقہ ہے جو کسی بھی صورت ہار ماننے کو تیار نہیں ہے۔

حکومت کے پاس قوت کے بے شمار ذرائع ہیں' وسائل کی کمی نہیں ہے۔ اگر کمی ہے تو عاقبت اندیشی کی۔ دوسری طرف جو قوت ہے وہ اس مسئلے کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھ بیٹھی ہے۔ آج اس کے ہزاروں جوان سندھ کی مختلف جیلوں میں مار کھا رہے ہیں۔ عقوبت خانے ان کا مسکن بن چکے ہیں۔ بے شمار افراد قتل کئے جا چکے ہیں۔ اہل کراچی واقف ہیں کہ یہ پولیس مقابلے کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض گھروں کے دو دو' چار چار افراد موت کی نیند سلائے جا چکے ہیں۔ ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے خاندان کے خود ہی واحد کفیل تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے آج باپ کے سائے کے بغیر کس طرح پرورش پا رہے ہیں' ان کے اہل محلہ سے کوئی جا کر پوچھے۔

بہرحال حکومت وقت کو ایک بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ سدا وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ آج جو تخت سجائے بیٹھے ہیں کل انہیں نیچے بھی آنا ہے اور وہ لوگ جو عقوبت خانوں میں زندگی کا ایک ایک لمحہ نفرت اور انتقام کی سوچ میں گزار رہے ہیں۔ وہ بھی کل باہر آئیں گے۔ اس زمین پر اسی فضا میں وہ اپنی زندگی کے ایام گزاریں گے۔ لیکن ان کے اندر کا انسان تبدیل ہو چکا ہو گا۔ یہ تبدیلی انتہائی خوفناک ہو گی جو زندگی کی ہر سطح پر نظر آئے گی۔ تفصیل میں جائے بغیر میں صرف اشارے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ورنہ بے شمار باتیں ایسی ہیں جو نفرت کے اس نقش کو گہرے سے گہرا تر کر رہی ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ سندھ کی سرزمین میں "نئے اوس اور خزرج" جنم لے رہے ہیں۔ ان کے درمیان وہ جاہلی کشمکش شروع ہو گی تو اس خطے کے لوگ ایک نئے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ تلوار کی جنگ سے زیادہ یہ جنگ خطرناک ہو گی' اس لئے کہ نفرت نفرت کو جنم دیتی ہے۔ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔

> "حکومت وقت کو ایک بات ہرگز نہیں بھولنی چاہئے کہ سدا وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ آج جو تخت سجائے بیٹھے ہیں کل انہیں نیچے بھی آنا ہے اور وہ لوگ جو عقوبت خانوں میں زندگی کا ایک ایک لمحہ نفرت اور انتقام کی سوچ میں گزار رہے ہیں' وہ بھی کل باہر آئیں گے"

اس جاہلی کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سائنسی دور میں کشمکش بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر تباہ کن ہوگی۔

اس گزارش کے بعد میں اہل وطن کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آگ کو بھڑکنے سے پہلے اسے بجھانے کی فکر کریں۔ وہ لوگ جو دین اور پاکستان سے محبت رکھتے ہیں انہیں چونک جانا چاہئے اور محض بیانات دینے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ حضورؐ کے اس فرمان کے مطابق کہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو۔ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کو پکڑ لو' اسے ظلم کے ارادے سے باز رکھو! حضورؐ کی بعثت سے قبل اوس اور خزرج صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے' اس بات کو مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے' سبھی واقف ہیں۔ حضور ﷺ نے ان ازلی دشمنوں کو باہم شیر و شکر بنا دیا۔ وہ کون سی تلوار تھی جس نے نفرت کی باڑھ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ شیطان کے ہر حربے کو ناکام بنا دیا۔ وہ اللہ کی کتاب اور نبی ﷺ کی سیرت تھی۔ حضورؐ آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی سیرت محفوظ ہے۔ اس سے جڑنے سے نفرت کے زہر کو زائل کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کی کتاب دنیا میں نظام عدل اجتماعی قائم کرنے کے لئے آئی ہے۔ وہ سراپا ہدایت ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے۔ اس عدل و قسط کا نظام جب تک قائم نہیں ہو گا' معاشرے میں اوس و خزرج جنم لیتے رہیں گے اور ان کے آپس میں برسر پیکار ہونے سے ہزاروں گھروں کے چراغ بجھتے رہیں گے۔ مختلف قومیتوں کو جوڑنے والی شے بھی یہی ہے۔ جنگ و جدال کو رکوانے والی کتاب بھی یہی ہے۔ انسانیت کی فلاح بھی اسی میں ہے کہ وہ بے چوں و چرا اس کے احکامات کی تعمیل کرے۔ آخرت کی سرخروئی بھی اسی کو اپنانے سے ہوگی۔

پاکستان میں جتنے نقطہ ہائے نظر موجود ہیں' وہ سب اس کتاب پر متفق ہیں۔ اس کے باوجود یہ کتاب اجنبی ہے۔ پاکستان کو قائم رکھنا ہے اور ترقی و خوشحالی سے ہمکنار کرنا ہے تو اس کتاب کے نفاذ کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم پھر قبائلی دور میں واپس چلے جائیں گے جو ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہا کرتا تھا۔ اگر اس سے بچ گئے تو کسی اور طاقت کی غلامی ضرور اختیار کرنی پڑے گی!!OO

سرحد میں تو دین قائم ہے!!

ــــــ ابو مونس قصوری ــــــ

ابھی کچھ عرصہ قبل دعوتی سلسلے میں پشاور کے ایک مضافاتی قصبے میں جانا ہوا۔ دیہات کی زندگی میں اپنا ایک جداگانہ ثقافتی رنگ تھا۔ لوگوں کی جلالی طبیعت شاید تیر و تفنگ کے کھیل نے پیدا کر دی ہے جو طویل ماضی سے چلا آ رہا ہے۔ وہاں انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ کچھ اجتماعی پروگرام بھی منعقد کئے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے قرآن کی انقلابی فکر واضح ہو سکے جو جمہوری تصور کے پھیلاؤ میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔

راقم نے بھی "تصور دین" کے موضوع پر گھنٹہ کے لگ بھگ گفتگو کی۔ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ یہ مذہب نہیں بلکہ دین ہے جس میں صرف عقائد' عبادات' رسم و رواج ہی نہیں بلکہ اس میں ہمارے لئے معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام بھی ہے۔ نیز زندگی کے یہ چھ کے چھ گوشے (عقائد' عبادات' رسم و رواج' معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام) مل کر دین کہلاتے ہیں۔ ان میں سے پہلے تین گوشے فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں اور دوسرے تین فرد کی اجتماعی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔

دین کے غلبے سے اصلاً اس کا اجتماعی نظام مراد ہے۔ اسلام کا یہ اجتماعی نظام غالب ہو تو یہ دین کی شکل میں ہوتا ہے ورنہ عملاً مذہب ہی بن جاتا ہے۔ آج دنیا میں کہیں بھی اللہ کا عطا کردہ نظام عدل و قسط قائم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مسلم اکثریت والے ممالک نے بھی اپنا اجتماعی نظام اسلام کے علاوہ کہیں اور سے مستعار لیا ہوا ہے۔ آج اس کو پھر قائم کرنا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کام کیا۔ آپ کے صحابہؓ نے بھی یہی کام کیا اور امت کا بھی یہی کام ہے۔ جو نبیؐ کا مقصد وہ ہمارا مقصد' جو نبیؐ کا طریقہ وہ ہمارا طریقہ۔

نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت قرآن مجید نے غلبہ دین حق ہی قرار دیا ہے اور آپؐ اور آپ کے صحابہؓ نے ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اس مشن کی تکمیل فرمائی۔ اسلام میں جہاد و قتال کی غرض و غایت ہی اقامت دین ہے۔ ایمان والوں کو قرآن بار بار مخاطب کر کے پکار رہا ہے کہ اس دین کو قائم کرنے کے لئے اٹھو' جدوجہد کرو۔ جان مال کھپاؤ۔ اس کے بغیر دعویٰ ایمان بے معنی ہے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے اور اس کی ادائیگی میں ہی تمہاری دونوں جہانوں کی کامیابی مضمر ہے۔

جب بھی لفظ "دین" ہمارے سامنے آتا ہے تو اس سے مراد صرف نماز' روزہ یا خاص وضع قطع نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ نظام عدل و قسط مراد ہوتا ہے۔ یہی چیز کسی قدر واضح ہو کر حدیث میں آئی ہے کہ "بنی الاسلام علی خمس ..." یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ وہ پانچ چیزیں کلمہ' نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہی پانچ چیزیں اسلام ہیں بلکہ یہ پورا ڈھانچہ ہے جو ان کے اوپر قائم کیا گیا ہے' اور وہ پورا اجتماعی نظام ہے۔

مقامی لوگوں نے بڑے غور سے باتیں سنیں اور چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بات نئی بھی معلوم ہو رہی ہے اور سمجھ میں بھی آ رہی ہے۔ درس کے اختتام پر سوالات کی بھی اجازت تھی۔ سوال تو کسی نے نہ کیا البتہ ایک اللہ والے نے مشورہ ضرور دیا جس کے سننے کے لئے کلیجہ تھامنا پڑا۔ اگرچہ وہ بیچارے پوری امت کی خیر خواہی کے جذبہ سے سرشار تھے لیکن آہ! وہ تصور جامد اتی......

ان بزرگ کا تعلق محکمہ تعلیم سے تھا' پڑھے لکھے عمر رسیدہ تھے لہٰذا بہت کچھ پالینے کی بے قراری کے ساتھ ہم لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ الحمدللہ سرحد میں تو بہت دین ہے' کوئی گھر ایسا نہیں جس میں نمازی نہ ہوں لیکن سندھ میں دین نہیں ہے' لوگوں کو نماز جنازہ تک نہیں آتی مساجد ویران پڑی ہیں' وہاں پر جانا چاہئے۔ اب راقم پہلے ہی دین کے اس محدود تصور کی نفی میں "حقیقت دین" کے موضوع پر گھنٹہ بھر بول چکا تھا۔ ویسے بھی یہ ساتھی سمجھنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے لہٰذا "قالوا سلاما" ہی میں عافیت سمجھی۔ بہرحال ان کے اس مشورہ پر علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آیا کہ۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

سیاسی عمل.....یا بد عملی!!

سیاست کی لنکا میں سب ہی باون گزے ہیں!

جماعتی وفاداریاں خریدنے (ہارس ٹریڈنگ) کی جو ریت ۸۸ء میں حکمران پارٹی نے ڈالی تھی اس کے متوقع نتائج پر مرحوم اقتدار احمد کا فکر انگیز اداریہ

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجتماعی سطح پر ہماری حد سے گزری ہوئی پستی' ہمہ جہت زبوں حالی اور انگریز اور ہندو جیسے طاقتور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ہمیں امن و سلامتی کی یہ چار دیواری پاکستان کی صورت میں عطا فرمائی اور عالم امر میں اپنے فیصلے کی عالم اسباب میں تعمیل کے لئے قائداعظم جیسا بلند کردار اور کسی بھی قیمت پر بک نہ سکنے والا رہنما بخشا تو اس کی رحمت کو جوش دلانے کی غرض سے عرش تک صرف ہماری آہیں ہی نہیں پہنچی تھیں' یہ عہد و پیمان بھی استغاثہ کا حصہ تھا کہ ہم اپنے خوابوں کی جنت' ارض پاک میں اس کا کلمہ بلند کریں گے' حاکمیت کا حق اسی کے لئے مخصوص کر دیں گے اور زمین کو جس کی آنکھیں فلاح و نجات کے لئے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں' روشنی اور رہنمائی کے لئے اسلام کی مادی اور روحانی برکات کا مینارہ نور فراہم کریں گے۔ کوئی مانے یا نہ مانے' ہم تو اسی بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان اللہ کے دین کی کبریائی اور نظام اسلام کے نفاذ کے لئے عالم وجود میں آیا تھا اور اسی نظریئے کی بنیاد پر ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے وطن کی سلامتی' بقاء اور استحکام کا راز خالص اسلام کے حقیقی نفاذ میں ہی مضمر ہے۔ ہم سیرت طیبہ' مسلمانوں کی چودہ صدیوں پر محیط تاریخ' خود اپنے چالیس سال سے زیادہ طویل تجربات اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت غور و فکر کی روشنی میں اس نتیجے پر بھی پہنچے جس پر ہمیں پورا اطمینان میسر ہے کہ نظام اسلام کے جیسے نفاذ کی بات ہم کر رہے ہیں وہ انقلابی عمل ہی سے ممکن ہے' جمہوری تماشے اور سیاسی شعبدہ بازی سے نہیں۔

اس کے باوجود ہم اگر وطن عزیز میں جاری و ساری سیاسی اور جمہوری عمل کے انداز اور طور طریقے پر فکرمندی کا اظہار کرتے ہیں تو اس کی وجوہ بھی سمجھ میں آ جانے والی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام کے لئے انقلابی جدوجہد کی آواز تو تاحال صرف ایک حلقے سے اٹھی ہے جس کا اثر و نفوذ محدود ہے' البتہ مروجہ سیاست اور جمہوریت کی راہ سے اسلام یا

> "ہمیں اس بات پر پورا اطمینان میسر ہے کہ نظام اسلام کے جیسے نفاذ کی بات ہم کر رہے ہیں وہ انقلابی عمل ہی سے ممکن ہے' جمہوری تماشے اور سیاسی شعبدہ بازی سے نہیں"

نظام مصطفیٰ کے قیام کا نعرہ مسلسل اور ہر چہار طرف سے بلند ہوتا رہا۔ اس ذریعے سے اسلام تو جتنا کچھ یہاں آ سکا ہے کسی سے چھپا ہوا نہیں' تاہم سیاسی عمل کی بدعملیوں کے سبب سے ملک کی سلامتی بار ہا داؤ پر لگی' سقوط ڈھاکہ کا المناک سانحہ سیاسی حکمت عملی کے فقدان کے باعث قوم کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ بنا اور آج بھی افق ملت پر افتراق و انتشار کے جو سیاہ بادل نظر آتے ہیں وہ بھی دراصل سیاسی بے تدبیری اور بے اصولی کا دھواں ہے۔ ہماری رائے میں ملک کے بقا اور استحکام کے لئے اسلام کا دلی آمادگی اور عزم کی پختگی کے ساتھ عملی نفاذ ضروری ہے تو یکجہتی و سلامتی کے لئے فوری تدبیر کے طور پر سیاسی عمل اور جمہوریت کی کارفرمائی میں صحت مندانہ رجحانات کا فروغ بھی کم ضروری نہیں۔ دوسرا سبب سیاسی اور جمہوری عمل سے ہماری دلچسپی کا یہ ہے کہ دنیا تمدنی ارتقاء کی ایسی منزل پر پہنچ چکی ہے کہ وطن عزیز میں دین کا بول بالا ہو ---- اور ان شاء اللہ ہو کر رہے گا ---- تب بھی سیاست اور جمہوریت (اللہ کی حاکمیت مطلقہ کی حد کے اندر اندر) بدستور ہمارے نظام حکومت کی ریڑھ کی ہڈی رہے گی۔ چنانچہ ہم پورے خلوص سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ یہاں عوام و خواص کی سیاسی تربیت مثبت اور تعمیری بنیادوں پر ہو۔

لیکن حالات نگاہوں کے سامنے جو نقشہ کھینچتے ہیں وہ کسی بھی طور خوش آئند نہیں۔ سیاست کی گنگا ہے تو الٹی بہتی' جماعتوں کا حال دیکھئے تو ابتر' انگلیوں پر گنے جا سکنے والے چند سنجیدہ و متین زعماء کو چھوڑ کر سیاسی رہنماؤں کی لنکا میں جو ہے سو باون گز کا' بیشتر سیاسی طائفوں (بلکہ بدقسمتی سے بعض دینی گروہ بندیوں کا بھی ---) قبلہ تک راست نہیں' جماعتی وابستگی محبوب کا مزاج یا کراچی کا موسم ہو گئی کہ بدلتے دیر لگے نہ بگڑتے پتا چلے اور نظریئے یا اصولوں کے سکوں کا کوچہ سیاست میں چلن ہی نہیں رہا۔ نگاہ بازگشت ڈالئے تو ہمارے ہاں راتوں رات سیاسی جماعتیں بنیں اور ایک تنکا توڑے بغیر کرسی اقتدار پر براجمان بھی ہو گئیں۔ ماضی کی الا ماشاء اللہ' ساری کی ساری سیاسی سرگرمیاں اور جوڑ توڑ کی مشق میدان میں' عوام کے سامنے اور ان کی شرکت سے نہیں'

"سیاسی عمل کی صحت مندانہ اور مثبت نشوونما وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ہے"

ڈرائنگ روم میں شطرنج کی بازی کی طرح یا ہوٹلوں کی لابیوں اور لاؤنجوں میں سرگوشیوں کے پراسرار انداز میں ہوئی۔ سیاسی وفاداریاں بدلنے کے لئے صاحبان اقتدار کے چشم و ابرو کے اشاروں کا انتظار کیا گیا۔ غرض محسوس یوں ہوتا ہے کہ پاکستان میں قومی سیاسی جماعتوں اور مثبت سیاسی عمل کی داغ بیل ڈالی ہی

اعتبار سے اتنا مایوس کن ہے کہ اس کی یاد بھی عذاب قرار دی جا سکتی ہے۔ تاہم جدید دور جمہوری جو سیاسی عمل کی تجدید اور جمہوریت کے احیاء کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ شرافت کی سیاست کے دل فریب عنوان کے تحت شروع ہوا' اس نے بھی سیاست کے باب میں ملک و قوم کی کم نصیبی میں اضافہ ہی کیا ہے۔

وفاداری کو بازار کی جنس بنا کر مول تول کی ایسی ریت ڈال دی گئی کہ ہر سیاسی جماعت کی قیادت ہمہ وقت اپنی بھیڑوں کو سمیٹنے میں لگی رہتی ہے۔ کہاں کی تنظیم' کیسا منشور' کون سا "ہوم ورک"۔ سیاسی لیڈروں کو کنکھیوں دائیں بائیں دیکھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ادھر والا موجود بھی ہے؟ ادھر والا کھسک تو نہیں

"چند سنجیدہ و متین زعماء کو چھوڑ کر سیاسی رہنماؤں کی لنکا میں جو ہے سو باون گز کا"

نہیں گئی۔ قائداعظم (اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے) کی مرحوم و مغفور مسلم لیگ بھی فی الحقیقت ایک تحریک تھی' جماعت نہیں اور آزادی بھی کسی سیاسی عمل کے نتیجے میں نہیں ملی بلکہ مسلمانوں کے جذبوں کا سیل بے پناہ غلامی کے بند کو بہا کر لے گیا تھا جسے ایک صاحب کردار' مستقل مزاج اور ماہر قانون دان لیڈر نے ایک سمت اور رخ پر ڈال دیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے اس محسن رہنما کو جس کی جیب میں بقول خود "کھوٹے سکے" تھے' حالات کی سنگینی اور صحت کی مخدوش حالت نے اتنا موقع نہ دیا کہ ایک نو آزاد ملک کی ضروریات پوری کر سکنے والی کسی سیاسی جماعت کا خاکہ مرتب کر سکتا یا مسلم لیگ ہی کو کھوٹے سکوں سے پاک کر کے جمہوریہ پاکستان کی شان کے

غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں سرکاری مسلم لیگ کا قیام وہ بنیادی کجی ہے جس کے اوپر تعمیر ہونے والی ہماری سیاست کی پوری دیوار ہی کج ہو گئی۔ کیا لطیفہ ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ ہونے کے حلف نامے کاغذات نامزدگی کے ساتھ داخل کر کے منتخب ہونے والے اراکین اسمبلی کو یہ حلف لازم قرار دینے والوں ہی کی طرف سے کہا گیا کہ ع "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ ملک کی سب سے بڑی اور چاروں صوبوں میں ہی نہیں بلکہ مرکز میں بھی مسند حکمرانی پر رونق افروز جماعت کی افزائش فطری طریقے سے نہیں' اوپر سے نیچے کی طرف ہوئی ہے اور خلوتیان راز کا یہ کہنا صد فی صد درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت روایتی معنوں میں کوئی سیاسی جماعت ہے ہی

"اس ملک میں جماعتی وابستگی محبوب کا مزاج یا کراچی کا موسم ہو گئی ہے کہ بدلتے دیر لگے نہ بگڑتے پتا چلے اور نظریئے یا اصولوں کے سکوں کا کوچہ سیاست میں چلن ہی نہیں رہا۔ نگاہ بازگشت ڈالئے تو ہمارے ہاں راتوں رات سیاسی جماعتیں بنیں اور ایک تنکا توڑے بغیر کرسی اقتدار پر براجمان بھی ہو گئیں"

شایان بنا دیتا۔ صد حیف کہ ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد صحت مند سیاسی عمل کے آغاز نے بھی نگاہیں پھیر لیں۔ اس ملک میں غیر سیاسی اقدامات کی وہ بھرمار ہوئی اور جمہوریت کی ادنیٰ ترین روایات کا گلا گھونٹنے والے ایسے ایسے پھندے پھینکے گئے کہ قومی مفادات نے سرپیٹ لیا' معقولیت اور شائستگی نے دہائی دی اور محب وطن اور اصول پسند سیاسی کارکنوں کو کونوں کھدروں میں منہ چھپا لینے میں ہی عافیت محسوس ہوئی۔ پھر بھی کوئی کمی رہ گئی تو پے در پے مارشل لاؤں نے سیاسی عمل کے تابوت میں آخری کیلیں بھی ٹھونک دیں۔ غرض ہمارے نوزائیدہ ملک کا ماضی اس

نہیں۔ اسے تو حکومتی پارٹی کا نام بتاتا ہے۔ جو حکومت میں ہے' وہ مسلم لیگ میں ہے' جتنے کالے' میرے باپ کے سالے۔۔۔۔ اور جو حکومت سے نکالا گیا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' سب سے پہلے اس نیک بخت پر ہی تین حرف بھیجے۔

چلئے اس ناپسندیدہ کیفیت کو بھی مخصوص اور غیر معمولی حالات کے ابتدائی مرحلے میں ایک ناگزیر عملی ضرورت کے طور پر گوارا کر لیجئے اور مزاج میں رچی بسی عادتوں کا غیر شعوری مظاہرہ قرار دے لیجئے' لیکن قیامت تو سرکاری مسلم لیگ بزعم خویش اپنے پاؤں جمانے کے بعد ڈھا رہی ہے۔ سیاسی وابستگی اور

گیا؟۔ بعض جماعتوں میں تو اس رستم زماں نے دوسری صف تقریباً پوری پوری الٹ دی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں "داخلے اور خارجے" بلدیاتی انتخابات میں ہی اہل نظر کے کان کھڑے کر دینے کو کافی تھے کہ تین سالہ مدت پوری ہونے پر خالی ہونے والی سینٹ کی نشستوں کے انتخاب نے تو گویا لٹیا ہی ڈبو دی۔ تحریک استقلال اور پاکستان پیپلز پارٹی پر بالخصوص سرکاری مسلم لیگ نے جو شب خون مارنے کی وارداتیں کی ہیں وہ نہ تو اس کی اپنی سیاسی بالغ نظری' پختگی اور مقبولیت کی شہادت دیں گی اور نہ سیاسی مسافروں کے قدو قامت میں اضافے کا باعث ہوں گی۔ ان حرکتوں سے ایک طرف سیاسی عمل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے تو دوسری جانب سیاسی جماعتوں اور میدان سیاست کے مردان کار پر سے عوام کا رہا سہا اعتماد اٹھ جائے گا۔

سیاسی عمل کی صحت مندانہ اور مثبت نشوونما وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ہے۔ مسلم لیگ کو سب سے بڑھ کر اور دوسری جماعتوں کو بساط بھر کوشش کرنی چاہئے کہ سیاسی افراتفری ختم ہو۔ جماعتوں اور ان کے متوسلین کو یہ شعوری اطمینان حاصل ہونا چاہئے کہ وہ بلاوجہ اور بغیر کسی مقصد کے اتفاقاً محض وقت گزارنے کے لئے جمع نہیں ہوئے بلکہ کسی پروگرام یا کسی منشور پر کام کرنے' سیاسی عمل کو آگے بڑھانے اور جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی پر ڈالنے کی غرض سے کسی نظم میں منسلک ہوئے ہیں۔ یہ نہ ہوا تو پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل کو ایک بار ہی رو لیا جانا چاہئے ع

خدا رائے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!!

(ماخوذ از ہفت روزہ "ندا" ۸ مارچ ۸۸ء)

دعوت کے مرحلے میں تصادم زہر قاتل ہے

طلبہ تنظیموں کے باہمی تصادم سے دین کو فائدہ کم' نقصان زیادہ پہنچا

میم سین کراچی

غلبہ و اقامت دین کا کام کرنے والوں کو اسوۂ رسول کو سامنے رکھنا ہو گا!

وطن عزیز کے تعلیمی اداروں میں سیاسی جماعتوں نے اپنے افکار و نظریات کے نفوذ کے لئے طلبہ تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ بظاہر تو یہ طلبہ تنظیمیں طلبہ مسائل کے حل کے لئے وجود میں آتی ہیں لیکن سیاسی جماعتوں سے وابستگی کی بناء پر ان کی سرگرمیاں ان حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں جو طلبہ مسائل کے حل کے لئے ضروری ہیں۔ نتیجتاً یہ تنظیمیں تصادم کی راہ پر چل نکلتی ہیں۔ آج ملک کے اکثر و بیشتر تعلیمی اداروں میں قائم طلبہ تنظیموں کا یہی حال ہے جس کی وجہ سے تعلیمی ماحول بگڑ کر رہ گیا ہے۔ طلبہ تنظیموں کے تصادم کے نتیجے میں طلبہ کے ہاتھوں میں قلم کی بجائے کلاشنکوف آ گیا ہے۔ جب صورتحال یہ ہو تو کیسی پڑھائی اور کہاں تعلیمی میدان میں طلبہ کے مسائل کے حل کی جدوجہد!! آئے دن تصادم کے نتیجے میں تعلیمی ادارے اکثر و بیشتر بند پڑے ہوتے ہیں۔ تعلیمی سیشن گذر جاتا ہے لیکن نصاب کی تکمیل کا مرحلہ نہیں آتا۔ امتحان کے دنوں میں نقل زور شور سے جاری رہتی ہے۔ اسلحہ سے کھیلنے والے طلبہ کو کس استاد کی مجال ہے کہ نقل سے روک دے۔ نقل کر کے پاس ہونے والے طلبہ ہاتھوں میں ڈگریاں لئے ہوئے ملازمت کے لئے دفاتر کا چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن ان کی قابلیت ملازمت کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ جو لوگ سفارش اور رشوتوں کی بنیاد پر ملازمتیں حاصل کر بھی لیتے ہیں وہ بھلا قوم کے کیا کام آ سکتے ہیں۔

بہت سی طلبہ تنظیموں میں ایک اسلامی جمعیت طلبہ بھی ہے جو جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم ہے۔ توقع یہ تھی کہ یہ تنظیم طلبہ کے مسائل کے حل سے زیادہ دین کی دعوت پر زور دے گی۔ شہر کی دیواروں پر آج اس تنظیم کی جانب سے جس قسم کی چاکنگ کی جا رہی ہے اس سے بھی بظاہر لگتا ہے کہ ایسا ہی ہو رہا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں اس تنظیم نے طلبہ میں دین اور اسکے حوالے سے اس کے تقاضوں سے آگہی کو عام کیا تھا اور خوب کیا تھا۔ لیکن ہر دعوت کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب داعی کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ اس موقع پر اگر اس نے حکمت سے کام لیا تو اس کی دعوت آگے بڑھتی ہے وگرنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ داعی دعوت کے متوقع نتائج نہ ملنے پر غلط راستوں پر چل نکلے۔ تعلیمی اداروں میں مختلف قسم کی طلبہ تنظیمیں ہوتی ہیں جن کی دعوت بھی مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ کسی کی دعوت کی بنیاد سوشلزم ہے تو کسی کی بنیاد قومیت پر ہوتی ہے۔ اور یہ وہ دعوتیں ہیں جن کی نفی دین کی دعوت کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی جمعیت طلبہ کا ان تنظیموں سے ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا۔

دین کی دعوت کے مراحل ہمیں نبی اکرمؐ کی سیرت سے ملتے ہیں۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دعوتی مراحل میں طاقت کا استعمال نہیں ہوتا۔ آپ پوری مکی زندگی پر غور کریں تو دعوت کے جو مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب دعوت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ گویا دعوت کو چٹکیوں میں اڑایا جاتا ہے۔ داعی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کبھی مجنون' کبھی ساحر تو کبھی کاہن اور شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن داعی اعظمؐ ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اب اندازہ لگایا جانا چاہئے کہ جس ہستی کو الصادق والامین کے نام سے پکارا جاتا ہو اس کو اگر مذکورہ بالا خطابات سے نوازا جائے تو اس کا دل کتنا بھچتا ہو گا۔ نبی اکرمؐ کا حال قرآن کریم میں وارد ان آیات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں انہیں تسلی دی جاتی ہے کہ آپ نہ مجنون ہیں نہ ساحر' نہ کاہن ہیں نہ ہی شاعر۔ لیکن اللہ کے رسول لوگوں سے نہیں الجھتے پھر جب دعوت مکے کے نوجوانوں میں اور معاشرے کے پسے ہوئے افراد میں پھیلتی ہے تو اہل قریش پریشان ہو جاتے ہیں تشدد کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے داعی اعظم تشدد کی زد میں آتے ہیں پھر دوسرے مسلمان۔ لیکن اللہ کے رسولؐ کا حکم یہی ہے کہ جوابی کارروائی نہ کی جائے۔ تشدد میں اضافے کے نتیجے میں پہلے ہجرت حبشہ کا حکم ہوتا ہے لیکن جب تک مدینے کا مستقر میسر نہیں آ جاتا جوابی کارروائی نہیں ہوتی۔

اسلحہ سے کھیلنے والے طلبہ کو کس استاد کی مجال ہے کہ نقل کرنے سے روک دے۔ نقل کر کے پاس ہونے والے طلبہ ہاتھوں میں ڈگریاں لئے ہوئے ملازمت کے لئے دفاتر کا چکر لگاتے رہتے ہیں لیکن ان کی قابلیت ملازمت کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے"

"ہر دعوت کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب داعی کا اصل امتحان ہوتا ہے"

اس کے برعکس ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جمعیت نے اول دن ہی سے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے اصول کو اپنایا۔ جماعت اسلامی جو اپنے آپ کو اب تک مکی دور میں ہونے کا دعویٰ کرتی ہے وہ بھی اپنی اس طلبہ تنظیم کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کرتی کہ دعوت دین میں پہلے ہی مدنی دور نہیں آتا بلکہ مکی دور کو گزارنے کے بعد مدنی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ نتیجتاً کارکنان جمعیت دوسری تنظیموں کے کارکنوں کے ہاتھوں موت کا شکار ہوتے ہیں' جن کو شہید قرار دیا جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ انہیں شہید نہیں کہا جانا چاہئے' لیکن شہادت کا تمغہ تو انہیں صرف وہ طبقہ عطا کر سکتا ہے جو دین کا شعور رکھتا ہو۔ لیکن ہماری قوم کی اکثریت کا حال معلوم ہے۔ ان کی عظیم اکثریت ان لڑائی جھگڑوں میں مرنے والوں کو ایک ہی سطح پر رکھتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ دوسری تنظیمیں تو ہیں ہی سیکولر مزاج کی لیکن یہ دیندار تنظیم کے کارکن بھی کلاشنکوف اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تنظیموں کو یکساں دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور ان کے اس رویئے سے تقویت دوسری طلبہ تنظیموں کو ملتی ہے۔

ایسے میں ہفت روزہ "تکبیر" کے مدیر نے جماعت اسلامی کے سامنے جو سوالات رکھے ہیں' واقعہ یہ ہے کہ اس پر جماعت اسلامی کو ضرور غور کرنا چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ یہ سوالات مدیر "تکبیر" نے اٹھائے ہیں۔ ممکن ہے یہی سوالات داور محشر جماعت اسلامی کے ذمہ داروں سے قیامت کے دن بھی پوچھ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے جماعت اسلامی اپنے آپ کو آزاد سمجھے تو اس میں اور دوسری جماعتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

اب میں آخر میں وہ سوال نقل کرتا ہوں جو مدیر "تکبیر" نے اٹھایا ہے۔ "گزشتہ چند برسوں کے دوران جمعیت کے ڈیڑھ درجن سے زائد نوجوان الطاف حسین کے ہدایت یافتہ دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں۔ یہ لڑکے معاشرے کا عطر تھے اور اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹانے کا حوصلہ رکھتے تھے' اس لئے شہادت کا درجہ پا گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس تنظیم کا یہ سرمایہ تھے اس نے ان عظیم نوجوانوں کی شہادت سے کیا حاصل کیا؟ ان میں کوئی بھی جوش یا سرگرمی پیدا ہوئی؟ اس کے ذمہ دار اور کارکنان شہید ہونے والوں کے خون سے نئے چراغ جلا کر اور اس سے حوصلے پا کر آئندہ کے لئے اپنے ساتھیوں کو تحفظ دینے میں کامیاب ہوئے یا تکئے میں منہ چھپائے اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو سدھارنے میں عافیت جانی؟ کیا جمعیت نے یہ نوجوان اس بیدردی سے قتل ہونے کے لئے تیار کئے تھے' کیا یہ کھیتی اسی لئے پکی تھی کہ لسانی سیاست کے علمبردار آئیں اور اپنی درانتیوں سے اسے اجاڑ دیں؟ اس وقت کھیتی کے رکھوالے سو رہے تھے. یا بزدلی' خوف یا مصلحت کوشی کا شکار تھے؟"۔OO

☆☆☆☆☆

مذہبی تعصب

ایک عیسائی انگریز خاتون ' مسز اے۔ ایم کو جنہوں نے تین سال قبل ایک یہودی سے شادی کی ہے 'طبی امداد کے لئے مقبوضہ القدس کے شعرج ئیدک اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ابتدائی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے اصل سوال پوچھا "کیا تم یہودی ہو؟" جس کا جواب نفی میں تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے ایک "غیر مسلم" کو علاج کی سہولت فراہم کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اسے ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال بھجوا دیا۔ اگرچہ اسرائیلی حکومت نے اپنے تمام شہریوں کو بلالحاظ مذہب طبی سہولت فراہم کرنے کی پابند ہے مگر مذکورہ اسپتال کو مذہبی یہودیوں کی سرپرستی حاصل ہے۔

لہو لہو کشمیر

سری نگر میں قائم صدائے آزادی نے ہفت روزہ دی مسلم ورلڈ (2 تا 9 ستمبر 1995ء) کو یہ رپورٹ بھیجی ہے۔ 1989ء سے وسط 1995ء تک کشمیری شہداء کی تعداد 24,700' خواتین کی بے حرمتی 3,600' اذیت دے کر جنسی طور پر ناکارہ بنائے گئے 6,100' زندگی بھر کے لئے معذور بنائے گئے 40235' گمشدگان 98,700' جبری طور پر بے دخل کئے گئے 60876 اس کے علاوہ 123 اسپتال اور سکول منہدم کئے گئے۔ 72200 گھروں کو جلایا گیا اور 19000 دکانوں کو آگ لگائی گئی۔ یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کا باقاعدہ اندراج ہے' اس کے علاوہ ہزاروں ایسے واقعات ہیں جو درج نہیں ہو سکے۔

صدارتی نظام اور خلافت راشدہ

جسٹس (ر) عبدالمجید ٹوانہ نے خبریں کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے موجودہ سیاسی ڈھانچے میں تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسلامی طرز حکومت جس کے وعدہ پر پاکستان بنا تھا' کی تشکیل ضروری ہے' اس کی بہترین مثال خلافت راشدہ ہے جو آج کل کے صدارتی نظام حکومت کے کافی حد تک نزدیک ہے اور ملک میں صوبوں کی موجودگی میں صدارتی نظام موزوں تر ہے کیونکہ پارلیمانی نظام صرف وہاں رائج ہو سکتا ہے جہاں برطانیہ کی طرح صرف ایک انتظامی یونٹ ہو۔ پاکستان میں سربراہ مملکت کو امریکی صدر کی طرح لوگ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر چار چار برسوں کے لئے براہ راست منتخب کریں گے۔ مقننہ بھی براہ راست منتخب ہو گی لیکن محدود الاختیار ہو گی۔ قانون شریعت یعنی احکام خداوندی و احادیث نبوی" کو تمام قوانین مع آئین پر سبقت ہو گی اور مقننہ کو اس میں ردوبدل کا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہو گا۔ مقننہ صرف وہ قانون بذریعہ اجتہاد بنائے گی جہاں قانون شریعت خاموش ہے یا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے حالات کے پیش نظر قانون سازی بصورت اجتہاد ضروری ہے۔ اراکین مقننہ صدر کو نہیں ہٹا سکیں گے۔"

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی!
گیا ہے دور حدیثِ لن ترانی!
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی' وہی آخر زمانی!

تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کے بارے میں

جناب منور حسن کے بیان میں کئی باتیں خلافِ واقعہ ہیں!

جماعت اسلامی کی تاریخ کے تین بڑے "خروج" اگر انہیں یاد ہوتے تو وہ یہ بات نہ کہتے!

آپ نے بجا فرمایا: جاگیرداری اور سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے یہاں اسلام نہیں آ سکتا!

جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل جناب منور حسن کے ایک اخباری انٹرویو پر جناب سردار اعوان کا اظہار خیال

روزنامہ "خبریں" نے جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل جناب سید منور حسن صاحب کا پچھلے دنوں جو تفصیلی انٹرویو شائع کیا ہے اس میں انہوں نے بعض بہت صحیح باتیں کہی ہیں۔ خاص کر بالواسطہ طور پر انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے اس دیرینہ موقف کی کھل کر تائید کی ہے کہ جب تک اس ملک سے جاگیرداری نظام کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کیا جاتا ملک میں کسی قسم کی مثبت اور دیرپا تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اس سے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہو گا کہ جماعت اسلامی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے موجودہ طریقہ کار پر بھی نظر ثانی کرے گی اور الیکشن کے راستے کو خیرباد کہہ دے گی اس لئے کہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جاگیرداری نظام کا خاتمہ الیکشن کے راستہ سے نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اس بارے میں جماعت اسلامی کی قیادت ہی فیصلہ کر سکتی ہے اور ہمیں حسن ظن سے کام لینا چاہئے کہ وہ اپنے لئے جو بھی لائحہ عمل اختیار کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے اسلام اور پاکستان کے حق میں خیر برآمد کر دے' البتہ ایک سوال کے جواب میں امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں غالباً صحیح صورتحال کا پوری طرح علم نہیں ہے یا پھر انہوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی تعداد میں نسبت تناسب کا جہاں تک تعلق ہے اول تو اس کا آپس میں موازنہ کرنا ہی درست نہیں اس لئے کہ دونوں میں شمولیت کی شرائط اور طریقہ کار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جماعت اسلامی میں کسی کو رکن بنائے جانے سے قبل ایک طویل عرصہ اسے خوب ٹھوک بجا کر دیکھا جاتا ہے اور اس کے فکر کی درستی اور عمل کی اصلاح کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کرنے کے بعد ہی اسے رکنیت سے مشرف کیا جاتا ہے جبکہ تنظیم اسلامی بیعت جہاد کی بنیاد پر استوار ہے اور اس میں ہر اس شخص کو جو اس میں شمولیت کا خواہش مند ہو' بغیر کسی تحقیق اور چھان پھٹک کے رفیق تنظیم بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس کی فکری و عملی تربیت کی جانب توجہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جن پر دینی فکر پوری طرح واضح نہیں ہوتا اور وہ محض وقتی طور پر کسی دینی جذبہ سے مغلوب ہو کر تنظیم میں شامل ہوتے ہیں' ان میں سے بعض تنظیم کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ایک فطری نظم جماعت ہے جو اسلاف کے طریقے سے زیادہ قریب ہے۔ تاہم اگر نکلنے والوں کی تعداد کا موازنہ کرنا ضروری ہو تو یہ کہنا تو ہرگز صحیح نہ ہو گا کہ جماعت اسلامی سے نکلنے والے حضرات' تنظیم اسلامی سے نکلنے والوں کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔ یہاں اعداد و شمار پیش کرنا مقصود نہیں ہے لیکن ایک عام آدمی بھی بخوبی یہ جان سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کی تاریخ میں "خروج" کے کم سے کم تین تو اتنے بڑے اور نمایاں واقعات رونما ہوئے ہیں جن کے ہم پلہ کوئی ایک مثال بھی تنظیم اسلامی میں' الحمدللہ اب تک سامنے نہیں آئی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں پہلا حادثہ جماعت کی تاسیس کے دو ہی سال کے اندر' ۱۹۴۳ء میں پیش آ گیا تھا جس میں مولانا منظور محمد نعمانی' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی (مرحوم) ایسے اکابر کے علاوہ اس وقت کے کل اراکین کی قریباً ایک تہائی تعداد جماعت سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے بحران کا اندیشہ ۱۹۴۶ء میں پیدا ہو گیا تھا جو مولانا کی "حکمت عملی" کے باعث ٹل گیا تھا۔

اس کے بعد ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کو اپنی تاریخ کے دوسرے بڑے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ اس وقت جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات بھی اس وقت کی مرکزی مجلس شوریٰ کی تقریباً ایک تہائی تعداد میں تھے۔ دیگر بہت سی اہم شخصیات اور عام اراکین اس کے علاوہ تھے جنہوں نے اس موقع پر جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح جناب نعیم صدیقی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کی حالیہ علیحدگی بھی کوئی کم اہمیت کی حامل نظر نہیں آتی۔ ہمارے نزدیک ان آخری دو علیحدگیوں کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ یہ خالص پالیسی سے اختلاف کی بنیاد پر عمل میں آئی ہیں جو کسی بھی اہم دینی جماعت کی قیادت کے لئے لمحہ فکریہ ہونا چاہئیں۔ اس لئے کہ ایسی جماعت کے پیش نظر اصلاً اپنے فرائض دینی کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور نجات اخروی کا حصول ہوتا ہے' دنیا میں اسلامی انقلاب کافی الواقع برپا ہو جانا ایک ثانوی چیز ہے۔ تاہم پالیسی کا اختلاف اس وقت نہایت اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ جب کسی کی رائے یہ بن چکی ہو کہ غلط حکمت عملی کے باعث ہم اپنے دنیوی ہدف یعنی غلبہ دین کی منزل سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس نوع کی غلطی پر اصرار کا نتیجہ دین سے دوری کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ان کوششوں اور پیش کشوں کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے جو وہ تنظیم اسلامی کے جماعت اسلامی میں "ادغام" اور اس کے ساتھ "وفاق" کے لئے کر رہے ہیں۔ محترم سید منور حسن صاحب نے اسے بھی

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

بقیہ : افہام و تفہیم

آخر میں میری فاضل مضمون نگار سمیت تمام دانشوران قوم سے گزارش ہے کہ وہ ڈاکٹر اسرار احمد کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تو ان پر تنقید ضرور کریں لیکن وہ تنقید تعمیری ہو اور اس کی پشت پر دلائل و براہین موجود ہوں۔ تنقید برائے تنقید سے آج تک نہ کوئی مسئلہ حل ہوا ہے اور نہ آئندہ ہونے کی کوئی امید ہے۔○○

بقیہ : ان کی بھی سنئے

ہو گی جو اس جدوجہد کے راستے میں دیوار بنے گی۔ مگر ہم ہتھیار کس کے خلاف اٹھائیں؟ پاکستان اور پاکستان کی افواج کے خلاف؟ نہیں، نہیں، ہم اور وہ دونوں پاکستان اور اسلام کی افواج ہیں، ہم اکٹھے ہتھیار اٹھائیں گے 'اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف اور پروردگار کی قسم' جب ہم مل کر ایسا کریں گے تو وہ منظر بڑا دلفریب اور مسحور کن ہو گا۔ اس دن ہمارے بچے روتے چیختے ہمیں رخصت نہیں کریں گے' اس دن رخصتی کے وقت ان کے ہاتھوں میں ہمارے تار تار دامن کے ٹکڑے نہیں پھول اور شہنائیاں ہوں گی۔

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

●

استحکام پاکستان

●

اشاعت خاص ○ اشاعت عام

-/۵۰ روپے -/۳۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن

فون: ۸۵۶۰۰۳

بہت ہی محترم بھائی! یہ اس ملک کے انصاف پسندوں پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح انسانی حقوق کے علمبرداروں' تنظیموں' اداروں اور اس کی نگہبان عدالتوں کو خبر کرتے ہیں کہ صوبہ سرحد کی جیلوں میں پڑے ہم ہزاروں انسانوں کا جرم حکومت سے معلوم کر کے ہمیں نہیں تو ہمارے لواحقین اور بچوں کو بتا دیں۔ آپ خود دیکھ لیں انصاف کا یہ جعلی نظام کیسے ننگا کھڑا ہے۔ اسی لئے تو ہم اپنے لئے عدالتی انصاف کا وہ نظام مانگ رہے ہیں جس میں کسی بھی انسان کے حقوق پامال نہ ہوں۔ کسی کے بچوں پر آدھی رات کو ریاستی دہشت گرد ستم نہ ڈھا سکیں۔

(بشکریہ روزنامہ "خبریں" ۲۲ ستمبر ۹۵ء)

بقیہ : مکالمہ

● میں اپنی صحافتی زندگی کے دوران حمید نظامی مرحوم سے متاثر ہوا ہوں اور کچھ نقوش میرے ذہن پر شورش کاشمیری کے ہیں۔ ان کے علاوہ قریب کے زمانے میں مجھے کوئی ایسا صحافی نظر نہیں آیا جس نے مجھے متاثر کیا ہو۔

✱ اگر اداریہ نگاری کی بات کی جائے تو آپ کس صحافی کی صلاحیتوں کے زیادہ معترف ہیں۔

● میں پھر حمید نظامی صاحب ہی کا نام لوں گا۔

✱ کس کالم نگار کے کالم آپ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

● کالم تو میں کوئی بھی نہیں چھوڑتا۔ البتہ اس دور کے کالم نگاروں میں سیاسی تجزیے مجھے ارشاد احمد حقانی صاحب کے پسند ہیں اور ہلکے پھلکے کالم ظفر اقبال صاحب کے۔

✱ ایک صحافی کی حیثیت سے قومی معاملات پر آپ کی نظر یقیناً بہت گہری ہوگی۔ یہ ارشاد فرمائیں کہ آپ کے نزدیک اس وقت پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے اور آپ اس کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

● میرے نزدیک پاکستان کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ جس نظریے کو بنیاد بنا کر ہم نے یہ ملک لیا تھا' اس نظریے کو یہاں جاری و ساری کیا جائے۔ یعنی اسلام کا یہاں نفاذ ہو اور صحیح معنی میں ہو۔ جنرل ضیاء الحق کی طرح جھوٹے اور کھوکھلے نعروں کے بجائے یہاں پورے خلوص کے ساتھ اسلام کو نافذ کیا جائے۔ ہمارے دوسرے تمام مسائل اسلام سے روگردانی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے دوسرے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اب جو ایک طویل عرصے کے بعد ملک میں جمہوری نظام بحال ہوا ہے۔ اس کو مستحکم بنانا بھی ضروری ہے۔ پاکستان کی بقا اور سلامتی کے لئے جمہوریت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یہاں جمہوری نظام جاری رہنا چاہئے اور پھر یہ کہ پاکستان کے اساسی مقاصد کو ہمیں کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے اور اس ملک میں خدا کے دین کو پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنا چاہئے!○○

بقیہ : جواب آں غزل

غالباً پوری طرح سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی اور اس کے موسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے احسان مند ہیں کہ ان کے ذریعے ان پر دین کے تقاضے منکشف ہوئے مگر ظاہر بات ہے کہ اشتراک عمل کے لئے کسی نہ کسی درجے میں پالیسی کا اتفاق ضروری ہے۔ اس جانب پیش رفت تبھی ممکن ہے جب دونوں فریق اپنے طرز عمل پر نظر ثانی اور دوسرے کے موقف پر غور کرنے کے لئے سنجیدگی سے آمادہ ہوں۔ اگر بات وہی ہے جو جناب سید منور حسن صاحب نے فرمائی ہے کہ جاگیرداری اور سود پر مبنی سرمایہ داری کے ہوتے ہوئے یہاں اسلام نہیں آ سکتا تو اس پر آپس میں تبادلہ خیالات ہونا چاہئے اور اگر یہ محسوس ہو کہ الیکشن میں حصہ لینا محض وقت کا ضیاع ہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے یا کم از کم کچھ مدت تک ترک کرنے کا فیصلہ کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے۔

آخر میں محترم منور حسن صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جہاں تک جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی تنظیم اسلامی میں شمولیت کا تعلق ہے ہم نہیں سمجھتے کہ انہیں کبھی بھی ڈاکٹر صاحب کے فکر اور طریقہ کار سے اتفاق رہا ہے۔ وہ اسلام کے اس حرکی اور انقلابی فکر کی جڑیں کاٹنے کے درپے ہیں جس کے احیاء میں مولانا مودودی مرحوم کی کاوشوں کو بڑا دخل ہے۔ لہٰذا ان کی شمولیت کا نہ کوئی امکان تھا اور نہ ہی ان کی عدم شمولیت پر ہمیں کوئی رنج ہونا چاہئے۔ باقی جن بزرگ حضرات کے انہوں نے نام گنوائے ہیں ان کی تنظیم اسلامی میں شمولیت ہمارے لئے باعث سعادت ہوتی مگر ہمیں افسوس ہے یہ حضرات ڈاکٹر صاحب کی تنظیم اسلامی میں کبھی شامل نہیں رہے' لہٰذا تنظیم اسلامی سے ان کی علیحدگی کا سوال اٹھانا ہی بالکل بے معنی بات ہے!۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

باطل نظام میں انسانوں کا درجہ حیوانوں سے بھی فروتر ہے!

ہماری دشمنی نہ فوج سے ہے نہ عوام سے بلکہ باطل نظام سے ہے!!

وہ وقت دور نہیں جب ہم اپنی فوج کے ساتھ مل کر باطل نظام کو نیست و نابود کر دیں گے

ایک اسیر شریعت کی نہایت قابل توجہ' پر سوز باتیں---جو ایک روزنامے میں غیر نمایاں انداز میں شائع ہوئیں

خوفناک ظلم اور شرمناک فسطائیت کے اس دور میں کہاں ہیں بنیادی انسانی حقوق کے وہ ادارے اور چیمپئن؟ اسلام کے نام سے اگر چڑ ہے تو کیا ہم انسان بھی نہیں ہیں اور ہاں میں نے سنا ہے کہ عدالتیں خود بخود انسانی حقوق کی پامالی کا نوٹس لیتی ہیں لیکن شاید پاکستان میں ابھی تک کوئی ایسی عدالت لگی ہی نہیں جو ہم جیسے "جانوروں" کو انسانیت کے رتبے پر فائز کر دے۔ ہم نہ سہی ان تڑپتے اور بلکتے معصوم بچوں کو تو انسان سمجھئے' جن سے آدھی رات کو کچھ اس انداز سے ان کے باپوں کو چھین کر گھسیٹا گیا کہ ہلاکو اور چنگیز کی روح بھی شرما گئی ہو گی۔ وہ بچے جو خدا جانے ہماری غیر موجودگی میں فاقوں سے کس طرح لڑ رہے ہوں گے' انصاف کے نگہبانوں اور علمبرداروں سے کہہ دیجئے کہ ہم اور وہ بچے انتہائی مظلوم اور ستم رسیدہ انسان ہیں' خالص پاکستانی اور خالص مسلمان ہیں۔ سو ہم بھی بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔

جناب والا! ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم وہ عدالت مانگ رہے ہیں جہاں اس طرح آدھی رات کو ظلم کرنے والوں سے فوری باز پرس ہو' جس کی نظر میں ہر انسان' انسان ہو' جہاں مجھ جیسے ایک غریب کی اگر بکری چوری ہو جائے تو اس کے حصول کے لئے اسے دس بکریاں بیچ کر انصاف حاصل نہ کرنا پڑے۔ ہمیں وہ عدالت اور منصف چاہئے جہاں توہین رسالتؐ کے مجرموں سے خصوصی اور وی آئی پی سلوک نہ ہو بلکہ سب سے غریب اور مظلوم فریادی ہی وہاں وی آئی پی ہو۔

اگر اس حکومت نے یہی ٹھان رکھی ہے کہ اسلام اور شریعت کا نام لینے والوں پر اسی طرح روز رزو بلاجواز لشکر کشی کرنی ہے۔ ہمارے بزرگوں' نوجوانوں' ماؤں اور بچوں تک کو قتل کرنا ہے تو ہم نے بھی ہر ظلم اور جبر کو سہنے کی قسم کھائی ہے۔ ہم اتنا ظلم سہ لیں گے' اتنی گولیاں کھالیں گے' اتنی لاشیں اٹھا لیں گے کہ ظلم کا ساتھ دینے والوں کا ضمیر خود بخود جاگ اٹھے گا۔ ہم نے تشدد کرنا ہوتا تو سب سے پہلے یہ راستہ میں اختیار کرتا' جب تحریک کے آغاز میں اپنے ہاتھوں سے میں نے ملیشیا کے ہاتھوں بونیر میں قتل ہونے والے تیرہ بچوں کی لاشیں اٹھائیں۔ تشدد ہمارا راستہ ہوتا تو جذباتی کارکنوں کے ہاتھوں یرغمال بننے والے ۷۲ سرکاری اہلکار سب کے سب محفوظ اور آزاد نہ ہوتے' اس کے باوجود کہ ہمیں ۳۵ لاشیں پیش کی گئیں۔ ہم نے بغاوت کرنی ہوتی تو ذرا سوچیں جب چیلاس سے درگئی تک اسلام کے نام لیوا اسلام کے نام پر مسلح جدوجہد پر اتر آئیں تو وہ کونسی حکومت

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

. . . . . گر اعتبار ہوتا!!

پاکستان کو اسلامیانے کی غرض سے قائم اسلامی نظریاتی کونسل دسمبر ۱۹۹۳ء سے ٹھپ پڑی ہے۔ صدر فاروق احمد لغاری چونکہ اپنی وہ آئینی ذمہ داری پوری نہیں کر پائے جس کی رو سے کونسل کے کم از کم دو ممبران کا سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کا سابق یا موجودہ جج ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کم از کم ایک خاتون ممبر کا تقرر لازم ہونا ضروری ہے۔ موجودہ حکومت نے دسمبر ۱۹۹۳ء میں نئی کونسل تشکیل دی تھی مگر پورا ایک سال آٹھ ماہ اور سولہ روز گزر چکے ہیں نہ تو کسی جج اور نہ ہی خاتون رکن کی تقرری عمل میں لائی جا سکی ہے۔

ہمارے ہاں جو بھی صدر آتا ہے وہ اپنے نقطہ نگاہ سے آئین کا مطالعہ کرتا ہے۔ بیورو کریٹک پس منظر کے حامل صدر ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل B (2) 58 سے آگے نہیں جاتے اور سارا زور سیاست کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک کرنے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اور اگر صدر کوئی سیاسی شخصیت ہوں تو ان کی توجہ کا مرکز و محور آرٹیکل 234 قرار پاتا ہے۔ بادردی صدر کی بات ہی اور ہے۔ اس لئے کہ انہیں اپنے ہر اچھے برے ارادہ کی تائید آئین سے حاصل کرنا ہوتی ہے۔OO

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

اگر اس سے کچھ بھی عقیدت ہے تم کو تو اپنا وطیرہ بدلنا پڑے گا

(جلسہ میلاد النبی کے ایک اجتماع سے خطاب)

علامہ عامر عثمانیؒ

خراج عقیدت ادا کرنے والو خراج عقیدت سے کیا کام ہو گا
یہی ہے زبانی محبت کا عالم تو دین ہڈی اور بدنام ہو گا
اگر سن سکو تم تو روحِ محمدؐ خراجِ اطاعت کی طالب ہے تم سے
یہی ہے جو قول و عمل کی دو رنگی بہت درد انگیز انجام ہو گا
فقط خوش بیانی کے جوہر دکھا کر، کوئی قوم دنیا میں ابھری نہیں ہے
عمل چھوڑ کر صرف باتیں بنا کر، کوئی قوم دنیا میں ابھری نہیں ہے

یہ سچ ہے کہ میلاد و سیرت کے جلسے بظاہر ہیں بامِ سعادت کے زینے
یہ سچ ہے کہ نعتِ محمدؐ کے موتی ہیں ایماں کی انگشتری کے نگینے
مگر اے قصیدہ گرو یہ تو سوچو کہ بے روح لفظوں کی قیمت ہی کیا ہے
بنے ہیں کہیں نقشِ آبِ رواں پر، چلے ہیں کہیں خشکیوں میں سفینے
نبیؐ کی حیاتِ مقدس کو دیکھو، ملے گی سراپا جہاد مسلسل
وفا کی صلابت میں فولاد آہن، کرم کی لطافت میں رحمت مکمل

یہ سوچو کہ نورِ ہدایت کا پرچم جنابِ محمدؐ نے کیسے اڑایا
یہ سوچو کہ دبتوں کو کیسے ابھارا یہ سوچو کہ گرتوں کو کیسے اٹھایا
یہ سوچو کہ کیا چیز تھی جس کے بل پر خدا کے اکیلے پیمبر نے اٹھ کر
الٹ دی تھی ایوانِ روما کی مسند، پلٹ دی تھی صحرانشینوں کی کایا
یہی نا کہ اس بندہ باصفا نے جلایا چراغِ جہاد و عزیمت
یہی نا کہ میدان سعی و طلب میں نہ چھوڑا کبھی دامنِ استقامت

یہی نا کہ سارے زمانے سے کٹ کر اٹھایا خدا کی اطاعت کا پرچم
ہدایت کا امن و سعادت کا پرچم، وفا کا حقیقی محبت کا پرچم
وہ بدر و حنین و تبوک و احد کا جفاکوش جانباز یکتا مجاہد
وہ تھا جس کے مضبوط دستِ عمل میں جہاں سے نرالی شجاعت کا پرچم
وہ جرأت سراپا وہ ہمت مجسم وہ راتوں کا عابد وہ دن کا سپاہی
وہ جس نے سیاست کی زلفیں سنواریں وہ جس نے فقیری میں کی بادشاہی

اگر اسؐ سے کچھ بھی عقیدت ہے تم کو تو اپنا وطیرہ بدلنا پڑے گا
نفاقِ زبان و عمل سے گزر کر صداقت کے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا
خبر دے رہا ہے محمدؐ کا اسوہ کہ آساں نہیں ہے مسلمان ہونا
بہت امتحانات درپیش ہوں گے بہت سخت راہوں پہ چلنا پڑے گا
وہ شعب ابوطالب و شہر طائف برابر صدا پر صدا دے رہے ہیں
وہ مکہ کی خاکِ مقدس کے ذرے نقوش قدم کا پتا دے رہے ہیں

اٹھو مومنو! آج سے عہد کر لو حبیب خدا کی اطاعت کرو گے
عقیدت کے پہلو بہ پہلو عمل سے حقیقت میں تعمیلِ سنت کرو گے
وہ تابندہ اسلام جو رہ گیا ہے کتابوں کے اوراق میں دفن ہو کر
وفا کیشیوں سے جفاکوشیوں سے زمانے میں اس کی اشاعت کرو گے
یہ ذوقِ اطاعت سے خالی عقیدت، عقیدت نہیں صرف بازی گری ہے
جو ایثار و اقدام سے جی چرائے، محبت نہیں صرف بازی گری ہے